منزل منزل

اے حمید

http://www.pakistanconnections.com/ebooks

منزل منزل

(افسانے)

اے حمید

تعریف اس خدا کی

کیفے ڈی رائین میں بیٹھے بیٹھے جب شام غروب ہوتی ہے تو ہال کمرے کی منقش چھت سے لٹکتی ہوئی موی شمعوں کی نرم پر سکوں نیند ٹوٹ جاتی ہے اور فرش پر بچھے ہوئے پرانے قالینوں کے رنگ ان کی دھندلی چمک میں زیادہ پژمردہ نظر آنے لگتے ہیں۔ جھومتی ہوئی پھولوں بھری ڈالیوں کی مانند محورقص جوڑوں کے قدموں میں رقص نامکمل دائرے بن کر پھیلتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔

اور باہر مال کا فوری فانوسوں کی روشنی میں دور تک جگمگا اٹھتی ہے۔

اور روج، کوئی، پونڈز۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مال کی دلہنیں۔۔۔۔۔۔

پھر بجھے ہوئے سگریٹ، خالی ڈبیاں، مسلے ہوئے پھول۔۔۔۔۔۔۔ دلہنوں کا سہاگ!

ڈاکٹر تم نے کسی ایسی دلہن کو دیکھا ہے جس کا سہاگ۔۔۔۔۔۔۔

تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟ جین ابھی نہیں آئی لیکن وہ ضرور آئے گی۔ وہ تم پر جان چھڑکتی ہے۔

یہ آج رم کا رنگ کیسا ہے؟ اس میں پانی زیادہ ڈال دیا گیا ہے۔

”ویٹر؟“

”یس سر!“

”اٹھاؤ اسے، اس میں پانی زیادہ ہے۔“

”یس سر“

”یس سر کا بچہ!“

جین بڑی دردمند لڑکی ہے ڈاکٹر۔ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ وہ چست اور بھڑکیلا لباس بہت کم پہنتی ہے۔ وہ لپ اسٹک اور پاؤڈر بالکل استعمال نہیں کرتی۔ مگر کبھی کبھی جب سگریٹ سلگانے میری جانب جھکتی ہے تو کولڈ پونڈز کی ٹھنڈی خوشبو ضرور محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بھورے نرم بال پف اور پھولوں کی گنجلوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ گریٹا گاربو کی طرح وہ انہیں سادگی اور لاپروائی سے بناتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر اس کے چہرے پر سرخ سرخ دانوں کے نشان کیسے ہیں؟ کچھ عرصہ پہلے تو اس کے چہرے کی جلد پگھلے ہوئے

موسم کی طرح نرم اور بے داغ تھی۔ یہ میرے خیال میں خون کا جوش ہے۔ شاید اسی لیے وہ پاؤنڈز اور ویکس باقاعدگی سے استعمال کرتی ہے۔ ویسے عموماً اس کا چہرہ بڑا دلکش نظر آتا ہے۔ مگر تم اس کے لیے کوئی اچھا سا نسخہ کیوں نہیں تجویز کرتے۔

بخدا تمہیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے اور وہ بیچاری محض تمہاری خاطر ہسپتال میں کئی کئی گھنٹے ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتی ہے۔ تمہیں یاد ہے تم نے ایک بار کہا تھا۔ ''جین ڈیوٹی سے غیر حاضر مت رہا کرو۔'' اور اس نے کہا تھا۔ ''ڈاکٹر میری اصل ڈیوٹی اس وقت شروع ہوتی ہے جب میں تمہیں ملنے کوارٹر سے نکلتی ہوں اور میں اپنی ڈیوٹی سے کبھی غیر حاضر نہیں رہتی۔'' جین کی آنکھوں میں اس وقت کیسی چمک اور محبت تھی۔ اسے تمہارا بہت خیال رہتا ہے ڈاکٹر۔

وہ سگریٹ نہیں پیتی تھی۔ اسے شراب اور ہندوستانی لباس سے نفرت تھی۔ مگر تمہارے لیے سگریٹ بھی پیتی ہے تمہارے ساتھ بیٹھ کر وہ اب شراب کے کئی پیگ چڑھا جاتی ہے اور کبھی کبھی ہندوستانی لباس میں ملبوس وہ تمہارے ہمراہ سینما پر بھی چلی جاتی ہے۔

کبھی تم نے اس بارے میں بھی سوچا ہے کہ جین نے سگریٹ اور شراب کب شروع کی؟

تمہیں وہ دن یاد ہے جس روز ریگل میں ''Life Boat'' کا صرف ایک شو تھا اور میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ہسپتال پہنچا تھا۔ تم برآمدے میں ایک جگہ کھڑے دبلی پتلی نیم سپید اور بھورے بالوں والی نرس سے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں بیسن تھا جس میں اوزار اور زخموں پر سے اتاری ہوئی زرد روئی تھی۔ تم دونوں بات بات پر مسکرا رہے تھے۔ یہ منظر آنکھوں کو ٹھنڈک بخشنے والا تھا اور اگر مجھے شو کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہارے رومان میں کبھی مخل نہ ہوتا۔ میرے کھانسنے پر تمہاری نظر مجھ پر پڑی اور وہ نرس چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی تیزی سے آپریشن روم کی طرف گھوم گئی۔ تم میری طرف بڑھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور مجھے اپنے آپ پر نرس کا شبہ ہوا جو مجھے دیکھ کر اپریشن روم کی طرف بھاگ گئی تھی۔ تم نے بتایا تھا۔

''اس کا نام جین ہے۔ ناگپور سے تبدیل ہو کر آئی ہے۔ بڑی شریف لڑکی ہے۔ سگریٹ اور دیگر منشیات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔''

اور ڈاکٹروں کو۔۔۔۔۔۔۔؟

تم قہقہہ لگا کر ہنس پڑے تھے۔ تمہارے قہقہے کی آواز سن کر برآمدے میں پڑے ہوئے کئی مریضوں نے گردنیں پھیر کر ہمیں دیکھا تھا۔ تمہیں اس کی خبر نہیں تھی۔

کچھ دنوں بعد تم لارنس کے اوپن ایئر ٹی سٹال میں تھے۔ اس روز تم نے مجھ سے جین کا تعارف کروایا۔ دن ڈھل رہا تھا اور دھوپ

کا رنگ بھورا سنہری مائل ہو رہا تھا۔ ہمارے سروں پر لیچی کا چھوٹے قد والا گھنا درخت تھا۔ اس کے سائے میں لطیف خنکی تھی۔ ہم چائے پی رہی تھے۔ یہ میرا پہلا موقع تھا کہ میں نے جین کو اچھی طرح دیکھا۔ نیم سپید رنگ کی ایک سادہ سی لڑکی، جس کی آواز میں ہمدردی اور ملائمت تھی اور جو بڑی دلچسپی سے چائے پی رہی تھی۔ اس کے نرم رخساروں کے کناروں پر مدھم سی گلابی جھلک نمایاں تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ بے داغ تھا اور وہاں سرخ دانوں کا کوئی نشان نہ تھا۔

ٹی اسٹال سے اٹھنے کے بعد جب ہم ایک خاموش اور سایہ دار سڑک پر چلے جا رہے تھے تو میں نے غور سے دیکھا جین دایاں پاؤں ذرا دبا کے چلتی تھی۔ جس نے اس کی چال میں عجیب دلکشی پیدا کر دی تھی۔

تیسرے دن اتوار کی شام کو میں ایک مشہور کتاب گھر میں قسم قسم کی کتابیں اٹھا کر دیکھ رہا تھا کہ میں نے سامنے والے قد آدم آئینے سے جین کو آتے دیکھا۔ وہ ہلکے فاختائی رنگ کے لباس میں ملبوس تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سبز رنگ کا بیگ تھا۔ اس ملاقات کا ذکر میں نے تم سے کبھی نہیں کیا۔

وہ ایک جگہ کونٹر کے شیشے پر بیگ رکھے کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ یوں ظاہر کرتے ہوئے گویا میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہوں، میں بھی اس کے بالمقابل پہنچ کر ایک البم کو دیکھنے لگا۔

‘‘ہیلو،’’ جین نے مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

‘‘ہیلو جین!’’

اس کے کانوں میں تمہارے خریدے ہوئے بندے تھے۔ وہی سپید اور ہلکے نیلے رنگوں والے۔

‘‘یہ کتاب کیسی ہے؟’’ جین نے ہاورڈ سپرنگ کی ‘‘مائی سن، مائی سن’’ میری طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

‘‘مجھے تو پسند نہیں۔’’

‘‘مجھے پسند ہے اور میں اسے تیسری بار پڑھ رہی ہوں۔’’ اس نے بڑے اطمینان سے کہا، گویا اسے میری پسند یا ناپسند کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

‘‘یہ بندے بڑے خوبصورت ہیں۔ کیا دام اٹھے تھے؟’’ اور میں نے دیکھا جین کی ابریشمی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس نے کتاب کے صفحے پر نظریں گاڑے لرزتی آواز میں کہا۔

‘‘یاد نہیں رہا۔’’

نادان لڑکی مجھ سے اپنی محبت کا راز چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی اس بے سود کوشش پر ترس آ گیا۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ جین سگریٹ نہیں پیا کرتی میں نے سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔

”شکریہ میں تمباکو نہیں پیتی۔“ اور وہ خدا حافظ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ جیسے اس نے دکان میں اس نے کوئی خوفناک شے دیکھ لی ہو۔

وقت گزرتا گیا۔ شہر کے باغات میں پھلدار درختوں نے کئی بار لوگوں کو اپنے لذیذ پھلوں سے نوازا۔ ان باغات سے پرے کھیتوں میں کئی دفعہ فصلیں کٹیں اور پھر بوئی گئیں۔

جین تمہارے اور نزدیک آ گئی۔ لارنس کی سایہ دار پرسکون گذرگاہوں پر سے گزرتے ہوئے اس نے کئی بار تمہارے بازوؤں سے اپنا سر لگا کر نیم خوابیدہ آواز میں اپنی محبت کا اعتراف کیا۔

”ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔ میں ہر دم، ہر گھڑی تمہیں اپنے قریب دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”جین اس سے پہلے بھی تم نے کسی سے محبت کی ہے؟“

”اور اس دردمند بھولی سی لڑکی نے کتنی صاف گوئی سے اپنے محبوب کے سامنے اپنا دل کھول دیا تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔۔ بالکل نہیں ڈاکٹر!“

اتنی شدت سے میں کبھی کسی کی گرویدہ نہیں ہوئی۔ مجھے یاد ہے ناگپور میں میرا ایک بھتیجا تھا۔ اس کا نام جوزف تھا۔ وہ نویں جماعت میں تھا اور مجھ پر بری طرح فدا تھا۔ ڈاکٹر تم سن کر ہنسو گے جوزف مجھ سے آٹھ سال چھوٹا تھا۔ مگر مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ ہر روز میرے ہاں آتا اور کبھی خالی ہاتھ نہ آتا تھا۔ کبھی مٹھائی لے آتا، کبھی کوئی کریم کی ڈبی، کبھی پھل۔۔۔۔۔۔ اور جب اسے کچھ نہ ملتا تو نرگس کے لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے پھول ہی لے آتا تھا۔

مجھے بھی اس سے تھوڑی محبت ہو چلی تھی۔ دراصل محبت کی بجائے مجھے اس پر ترس آتا تھا۔

پھر میری یہاں تبدیلی ہو گئی۔ نہ جانے وہ کیا کرتا ہو گا۔ بے چارا بڑا بھولا بھالا سا تھا۔“

اور تم نے پوچھا تھا۔

”جین اگر تمہاری محبت اسے یہاں کھینچ لائے؟“

اور جین نے چمک کر کہا تھا۔

”تو میں اسے دھکے دے کر اپنے کوارٹر سے باہر نکال دوں گی۔“

کرسمس کا تہوار آ گیا۔ تم نے میرے ہوسٹل میں جین کو دعوت دی۔ اس شام تم کتنے گھبرائے ہوئے تھے۔ جیسے تم نے کسی کو قتل کرنے کا ارادہ کیا ہوا ہو۔ جین آئی۔ میرے خدا' ڈاکٹر اس شام وہ کتنی دلفریب لگ رہی تھی۔ اس نے لپ اسٹک اور کوٹی بے تکلفی سے استعمال کی تھی۔ اس کا نچلا ہونٹ اصلی گلاب کی گہری سرخ پتی کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔

کھانے کے دوران میں تم نے جین کو جنجر بیئر میں وائٹ جن ملا کر پلا دی۔ جسے وہ بالکل محسوس نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد تم نے اسے دوسرا پیگ بھی پلا دیا۔ کھانے کے بعد تم نے اسے امریکن لطیفے سنانے شروع کر دیئے۔ جین قہقہے لگا کر ہنس رہی تھی۔ مگر میں اس کی لمحہ بہ لمحہ گھٹتی ہوئی آنکھوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا' میرا سر درد کرنے لگا ہے' اور تم نے اندر جا کر جنجر بیئر میں اور جن ملا دی۔

اور پھر جین مسلسل مسکرا رہی تھی اور تمہیں تکے جا رہی تھی۔ اس کے جسم سے سرمستی و بے خودی فوارے کی مانند پھوٹ رہی تھی۔ تم نے مجھے اشارہ کیا۔ میں دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صوفے پر نیم دراز میں نے سگریٹ سلگایا اور کتاب پڑھنے لگا۔

اس دوران میں نے کئی بار جین کے قہقہوں اور گلاس کے ٹکرانے کی آوازیں سنی۔

جین بالکل مدہوش ہو چکی تھی۔

کتاب پرے رکھ کر' سگریٹ بجھا' میں صوفے پر ہی سو گیا۔ نہ جانے کتنی دیر تک سویا رہا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ خواب ایسی حقیقت میں میں نے سنا جین تمہیں کہہ رہی تھی۔

”ڈاکٹر آج کا دن مقدس دن ہے۔ آج حضرت مریم کے بطن سے ہمارا پیغمبر پیدا ہوا تھا۔“

”ڈاکٹر میں نے آج تک کسی سے شادی نہیں کی۔ میرا شباب شعلے کی طرح پاک اور بے داغ ہے۔ میں نے آٹھ سال بیمار انسانوں کی خدمت کی ہے۔ میں کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتی اور میں نے ابھی تک شادی نہیں کی۔“

”تم مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو ڈاکٹر؟“

مسیح کی قسم میرا شباب شعلے کی مانند ہے۔

اور وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی تھی۔

”جوزف ۔۔۔۔۔۔ میرا ننھا محبوب' نہ معلوم وہ لمبے ڈنٹھلوں والے نرگس کے پھول لے کر جاتا ہو گا۔“

میرے جوزف! میرے محبوب!! میرے بچے!!!

ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے آٹھ سال۔۔۔۔۔۔۔

اور تم اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دن نکل آیا۔ جین ادھ موئی سی ہو رہی تھی اور تم مسکرا رہے تھے۔ پھر سگریٹ اور شراب اس کی زندگی کا جزو بن گئے۔ ڈی رائین میں تمہیں شراب کے نقصانات گنوانے والی جین خود شراب کا آرڈر دینے لگی۔ اور رفتہ رفتہ اس کے شباب کا وہ شعلہ جو اس کے الفاظ میں پاک اور بے داغ تھا' دھوئیں کی تاریک لکیر میں بدل گیا۔ جین کے چہرے پر سرخ دانوں کا ایک جال بچھ گیا۔

تمہیں یاد ہے ڈاکٹر ایک رات اسی جگہ جین نے بیٹھے بیٹھے کہا تھا۔ وہ شراب میں بدمست تھی۔

اور جب وہ زیادہ جوان ہو جائے گی تو اسے میں اپنے ساتھ فرانس لے جاؤں گی۔ وہاں کئی ڈی رائین ہیں اور کئی ڈاکٹر ہیں اور تمہاری بیٹی میرے پاس رہے گی' تمہاری نشانی بن کر۔"

تم گھبرا رہے تھے اور اس کی زبان چل رہی تھی۔ وہ بولے جا رہی تھی' بکے جا رہی تھی' تیز رفتار ندی کی طرح جو فراز کوہسار سے نچان کی وادیوں کی طرف بہتی ہوئی اپنے ساتھ کئی پتھر جلی کٹی جھاڑیاں اور زہریلے جنگلی سانپ بہا کر لے آتی ہے۔

"میں سگریٹ نہیں پیتی۔ مجھے شراب سے نفرت ہے۔ میں نے آٹھ سال بیماروں کی خدمت کی ہے۔ میں مریم ہوں میں نائٹنگیل ہوں۔"

جوزف مجھے چاہتا ہے۔ ڈاکٹر بھی چاہتا ہے۔ سبھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اگلے کرسمس میں سبھوں سے شادی رچاؤں گی' جوزف سے بھی' ڈاکٹر سے اور ہاورڈ سپرنگ سے بھی۔ میں نے اس کا ناول چار مرتبہ پڑھا ہے۔ وہ لندن میں رہتا ہے۔ جوزف ناگپور میں ہے۔

میں ان کو بلاؤں گی۔

ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا سگریٹ۔۔۔۔۔۔۔۔ میری شراب!

میرا شعلہ! مائی سن! مائی سن!!۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جین رونے لگی تھی۔

ہمارے گرد کی میزوں پر سے لوگ ہمیں دلچسپی سے تک رہے تھے۔ تم گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور پھر ہم نے اسے بڑی مشکل سے تانگے میں بٹھلا کر اسے کوارٹر تک پہنچایا تھا۔

تم بڑے نیک دل ہو ڈاکٹر۔۔۔۔۔۔۔۔ تم جین کے لیے شراب اور ہندوستانی لباس مہیا کرتے ہو۔ جنہیں وہ صرف تمہاری خاطر

استعمال کرتی ہے۔ جین کی مانند تم سے بھی کسی کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ تم بھی چھ سات سال سے غریب بیماروں کی خدمت کر رہے ہو۔

بالی تمہیں یاد ہے' اس کے لیے بھی تم نے بہت کچھ کیا تھا۔ جین تو خود تھوڑا بہت کما لیتی تھی۔ مگر بالی کا تو سوائے ایک بوڑھی ماں اور ایک چھوٹی بہن کے کوئی نہ تھا۔ تم فرشتہ بن کر ان کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔ تم ابھی تک نہیں سمجھے؟ تم نیکی کرنے کے بعد اکثر اسے دریا میں ڈال دیتے ہو۔ یہ تمہاری پرانی عادت ہے۔ وہ رات یاد کرو۔ جب سردی اور ہلکی بارش سے ہم شہر کی پر پیچ گلیوں میں سے گزر رہے تھے۔ کیچڑ بھری گلیاں خالی اور ویران تھیں۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ ہم اس علاقے میں کیا کرنے گئے تھے۔ بہرحال ہم کیچڑ اور گڑھوں سے بچتے ہوئے سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ کہیں کہیں کسی مکان کے روشن دانوں پر ہلکی زرد روشنی کے دھبے سے دکھائی دیتے اور یا کسی جگہ بچے کے رونے کی کمزور آواز سنائی دے جاتی۔

ایک جگہ گلی کا موڑ مڑنے پر ہمیں کسی آدمی کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ ہم نے غور سے دیکھا تو ایک مکان کے بڑھے ہوئے چھجے کے نیچے دو تین آدمی کھڑے تھے۔ قریب پہنچ کر ہم بھی یونہی ٹھہر گئے۔ وہ آدمی جو سیڑھیوں میں کھڑی کسی عورت سے جھگڑ رہا تھا اچانک ہم سے مخاطب ہو گیا۔

”جناب ایک تو تین ماہ سے مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا اور پھر اوپر سے دھونس کہ جو کرنا ہے' کر لے۔“

”میں بھی آج پوری رقم لے کر ٹلوں گا۔ دیکھتا ہوں کون مائی کا لال مجھے اٹھاتا ہے۔“

”مائی کا لال ہوتا تو تمہاری گردن سامنے نالی میں ہوتی۔“ یہ آواز سیڑھیوں کے اوپر والے دروازے سے آئی تھی' اور اس میں آنسوؤں کی نمی اور تھرتھراہٹ تھی اور تم نے منہ اندر لے جا کر کہا تھا۔

”دیکھئے آپ کرایہ ادا کیوں نہیں کر دیتیں؟“

اوپر سے آنسوؤں بھری وہی کمزور آواز پھر آئی۔

”میرے لال! تیرے جیسا جو ابیٹا لڑائی پر گیا ہوا تھا' تین ماہ سے اس کا کوئی منی آرڈر نہیں آیا۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ تین ماہ کا کرایہ کہاں سے دیں؟“ اور تمہارا دردمند دل پسیج گیا۔ تم نے مالک مکان کو اپنا ایڈریس دیتے ہوئے کہا کہ تم کل رقم ادا کر دو گے۔ بوڑھی ماں تمہیں دعائیں دیتی رہ گئی۔ دوسرے روز تم نے کل حساب صاف کر دیا اور تیسرے روز تم اس گلی میں خود پہنچ گئے۔ بوڑھی عورت نے تمہیں کھڑکی سے دیکھ لیا۔ اس وقت تم اس گلی کے تین چکر لگا چکے تھے۔ وہ تمہیں لینے کے لیے خود گلی والے دروازے میں آئی۔

”اوپر آؤ بیٹا۔“

تم نے مصنوعی انداز میں کچھ پس و پیش کیا اور پھر اوپر چڑھ گئے۔ اوپر سوائے دو تنگ تنگ اور سیلے سیلے نیم روشن کمروں، ایک نمدار دالان، دو تین چارپائیوں، ایک دو کرسیوں اور چند برتنوں، صندوقوں اور ایک چرخے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ تمہارا دماغ چکرا گیا۔ تمہیں اوپر آنے پر افسوس ہونے لگا۔ بڑھیا نے جلدی سے لوہے کی ٹھنڈی کرسی پر اپنا دوپٹہ بچھا دیا۔ جسے تم نے اٹھا کر اسے واپس کر دیا۔ اس نے پوچھا۔

”کیا کھاؤ گے بیٹا؟ ہم تو غریب ہیں پھر بھی غریبی دعوے کا جو کچھ ہے، حاضر ہے۔“

تم نے انکار کر دیا۔ تم کچھ بے چین تھے اور تمہاری بے چینی بجی تھی۔ بھلا اس بڑھیا سے تمہیں کیا واسطہ تھا۔ تم نے نیکی کی تھی اور تم اسے حسب عادت دریا میں ڈال چکے تھے۔ بوڑھی بدستور اصرار کر رہی تھی۔

”اچھا اور نہ سہی، ایک پیالہ چائے ہی پی لو۔۔۔۔۔۔۔ بیٹی بالی! ذرا پانی تو گرم کرنا۔“

بالی۔۔۔۔۔۔ تم دفعتاً چونک سے پڑے۔ جیسے تم نیکی دریا میں ڈالنے گئے تھے اور وہاں کوئی جل پری دیکھ لی ہو اور تم بنسی لٹکا کر وہیں بیٹھ گئے۔ بالی اس بڑھیا کی جوان بیٹی تھی۔ تم خود بخود بڑھیا سے باتیں کرنے لگے۔ وہی گھر جو ایک لمحہ پہلے ویران اور بے رنگ تھا اور جہاں تمہیں کوفت محسوس ہو رہی تھی، اب طرح طرح کی دلچسپ اور رنگین چیزوں سے بھرا ہوا تھا اور تم سوچ رہے تھے کہ چائے کے بعد تم وہاں بیٹھ کر کھانا بھی کھا سکتے ہو۔

اور تمہیں یاد ہے تم نے اس رات کھانا بھی وہیں کھایا تھا۔

تم ہر دوسرے تیسرے دن بالی کے گھر جانے لگے۔ وہاں پہروں بیٹھے بالی ماں کو دنیا جہان کی باتیں سناتے رہتے۔ شروع شروع میں بالی تم سے پردہ کرتی تھی۔ مگر اب اس کا آنچل سکڑنے لگا تھا۔ وہ کئی بار دوہرا دوپٹہ کیے تمہارے پاس سے ہو کر گزر جاتی۔ کچھ دیر بعد یہ بھی دور ہو گیا اور ایک بار تم نے بالی کو سر سے پیر تک بھرپور نظر سے دیکھا۔ سانولے رنگ کی ایک عام وضع قطع کی لڑکی جس کا جوان اور پکا ہوا جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ اگرچہ وہ پردہ نہیں کرتی تھی مگر تمہارے سامنے کم بولتی تھی۔ لیکن بتدریج بالی تم سے گفتگو بھی کرنے لگی۔ محلے میں تمہاری بابت چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ مگر بالی کی ماں سیانی اور تجربہ کار عورت تھی۔ اس نے مشہور کر دیا، تم اس کے دور کے رشتہ میں بیٹے ہو۔ تم بہت خوش ہوئے کہ تمہارے دریا تک جا کر مچھلیاں پکڑنے میں اب کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ بالی کے گھر جا کر اس بڑھیا کے بیٹے کی بابت باتیں کرنے یا لڑائی کے تازہ حالات پر روشنی ڈالنے کے علاوہ تم نے وہاں

اطمینان سے دو تین گھنٹے گزارنے کی ایک اسکیم تیار کر لی تھی۔ تم نے بالی کی چھوٹی بہن کو جو دوسری جماعت میں تھی‘ پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کی ماں تمہاری اس مہربانی پر پھولے نہ سماتی تھی۔

سردیوں میں اکثر رات گئے تک تم بالی کی چھوٹی بہن کو پڑھاتے رہے۔ اس کی ماں ایک طرف بیٹھی چرخے پر ریشم کات رہی ہوتی۔ بالی اپنی چارپائی پر لحاف میں گھسی کبھی آنکھیں بند کر لیتی اور کبھی چمکیلی آنکھوں سے تمہیں دیکھنے لگتی اور اس کی چھوٹی بہن دیے کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی میں اسکول کا سبق دہرا رہی ہوتی۔ اردو کی دوسری کتاب اس کے گھٹنوں پر ہوتی اور وہ معصوم انداز میں کوئی کہانی یا نظم پڑھ رہی ہوتی تھی۔

تمہاری تنخواہ اور بالائی آمدن کا کافی حصہ بالی کے گھر پر خرچ ہونے لگا۔ اس دوران میں بالی کے بھائی کا منی آرڈر نہ آیا۔ (جو نہ جانے برما کے کون سے محاذ پر دشمن سے برسر پیکار تھا) قریباً چھ ماہ سے مکان کا کرایہ تم ہی ادا کر رہے تھے۔ بالی کی ماں بھلا پشم اور سوت کی تکلیاں گھما گھما کر یہ تمام خرچ کیسے اٹھا سکتی تھی۔ ہر ہفتہ راشن منگواتے وقت پیسے کم ہو جاتے تھے۔ جسے ایک مدت سے تم پورا کر رہے تھے۔ بالی چھوٹی بہن مینوں کا دوپٹہ اور اونچی ایڑی کا سینڈل پہن کر اسکول جاتی تھی اور خیر بالی کے لیے دو تین ریشمی سوٹ تیار ہونے ہی تھے۔

تم بڑی دیر سے نیکی کے دریا پر بنسی لٹکائے بیٹھے تھے‘ مگر جل پری پانیوں میں تھی۔ بہرحال تمہاری بنسی کی ڈور آہستہ آہستہ گہرے پانیوں میں اتر رہی تھی۔

ایک دن ------

اور وہ دن تمہیں اچھی طرح یاد ہوگا ڈاکٹر ------

جب تم بالی کے گھر گئے تو وہ گھر میں تنہا تھی۔ اس کی ماں پشم اور سوت دینے بازار گئی ہوئی تھی اور چھوٹی بہن ابھی سکول سے واپس نہ ہوئی تھی۔ بالی تمہیں اور اپنے تئیں اس گھر میں تنہا دیکھ کر کچھ گھبرا گئی تھی۔ اس کی ہر حرکت میں ایک اضطراری کیفیت تھی‘ جیسے اسے کسی انہونی شے کے ہو جانے کا دھڑکا لگا ہو۔ وہ تمہارے لیے چائے بنا رہی تھی اور تم خاموشی سے اس کی حرکات کو تکے جا رہے تھے۔ اس دوران میں نہ تم بولے تھے اور نہ ہی بالی نے کوئی بات کی تھی۔ چائے بنا کر اس نے ایک خوبصورت پیالے میں جسے تم خرید کر لائے تھے‘ ڈالا اور تمہاری طرف بڑھی۔

بروکیڈ کے زرتار سوٹ میں ملبوس‘ پیالی ہاتھ میں اٹھائے‘ مناسب اور متوازن قدم اٹھاتی۔

تمہیں اپنی جل پری کا خیال آ گیا۔ تمہاری ہنسی کی ڈور کو جھٹکا سا لگا اور تم نے پیالی تھامنے کی بجائے بالی کا ہاتھ تھام لیا۔

”چائے گر جائے گی۔“ بالی کی آواز خشک تھی۔ تم نے آہستہ سے اٹھ کر پیالی کرسی پر رکھ دی۔ بالی نے ایک جھرجھری لی۔

”کوئی آ جائے گا۔“ اور تم نے بالی کے گرم ۔۔۔۔۔۔ ہونٹوں پر اپنا منہ رکھ دیا۔ بالی کا جسم ٹھنڈا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ دفعتاً سیڑھیوں سے کسی کے قدموں کی آواز آئی۔

بالی تڑپ کر تمہاری آغوش سے نکل گئی۔ تم کرسی پر بیٹھ گئے۔ دروازے میں بالی کی ماں نمودار ہوئی۔ اس نے حسب عادت پہلے تمہارا سر چوما اور پھر ہاتھ پھیرا۔

تمہیں یاد ہے تم نے اس روز مجھے کیا کہا تھا۔

”میں نے آج ایک عجیب قسم کی خوشبو سونگھی ہے۔ یہ خوشبو بالی کے اوپر والے ہونٹ ۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے مونچھوں والی جگہ سے اٹھ رہی تھی ایسی خوشبو میں نے کسی پھول اور کسی کریم یا سینٹ میں نہیں سونگھی۔ اس خوشبو میں ایک علیحدہ اور انوکھی کیفیت تھی۔ یہ کیفیت اگر میں چاہوں بھی تو بیان نہیں کر سکتا۔“

اور پھر ایک رات آئی۔

سیاہ آسمان اور چمکیلے ستاروں والی ایک خوبصورت رات ۔۔۔۔۔۔

تم بالی کے ساتھ ایک کمرے میں تھے۔ دالان میں باہر بالی کی ماں سوت کات رہی تھی اور اس کے قریب ہی بالی کی چھوٹی بہن مدھم روشنی میں اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ دیے کی لو کانپ رہی تھی۔ سوت کی تکلیاں مدھم شور کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ اچانک بالی کی چھوٹی بہن نے پوچھا۔

”ماں“

”کیا ہے؟“

”آپ کی شادی ڈاکٹر بابو سے ہو گئی ہے؟“

”ہاں بیٹا“

اور اس کم سن بچی نے منہ پھلا کر کہا تھا۔

”پھر ڈھولک کیوں نہیں بجائی ماں؟ ہمیں مہندی کیوں نہیں لگائی تو نے؟ تم جھوٹ کہتی ہو ۔۔۔۔۔۔ آپ کی شادی نہیں

ہوئی۔“

دیے کی لو کانپ اٹھی تھی اور بوڑھی ماں نے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ وہ اپنی بچی کو آنسو نہیں دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”سبق اچھی طرح یاد کرو۔“

اور وہ کم سن بچی اچھی طرح سبق یاد کرنے لگی تھی۔

”تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا“

اور تم نیکی کے دریا میں جل پری کے ساتھ گہرے پانیوں میں اتر چکے تھے اور اس خدا کی تعریف جاری تھی جس نے جہاں بنایا تھا۔ دریا بنائے تھے اور دریاؤں میں جل پریاں چھوڑی تھیں۔

”ڈائس پر موسیقی شروع ہوگئی ہے۔

”یہ کون سے سر ہیں ڈاکٹر؟“

تم نے مغربی موسیقی کا مطالعہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ یہ سر۔۔۔۔۔۔۔ جیسے شام کے بعد گمنام جزیروں کے زمردیں ساحلوں پر سمندر کی لہروں کا والہانہ رقص۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر میرے ساتھ رہو۔ میں تمہیں تمہاری نیک دلی کے تیسرے قطب مینار کی طرف لیے جا رہا ہوں۔

یہ مینار سرد، دھندلا اور ویران ہے۔ یہاں سوائے نوراں کے اور کوئی نہیں ہے۔

نوراں۔۔۔۔۔۔ وہ گندے کپڑوں والی نوجوان لڑکی جو اپنے بوڑھے کوچوان باپ کو ہسپتال سے لائی تھی۔ اس کا باپ درد گردہ میں مبتلا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ نوراں کے پاس صرف پچیس روپے تھے۔ لیکن تم نے نوراں کے باپ ے لیے ایک کمرہ وقف کر دیا تھا اور اسے بھی وہیں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

اس ہمدردی کو دیکھ کر نوراں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ چار پانچ مہینوں کے مسلسل علاج کے بعد اس کا باپ بھلا چنگا ہو گیا تھا مگر نوراں بیمار ہو گئی تھی۔ اس کے پیٹ میں ہوا بھر گئی تھی۔ اس کا باپ پریشان تھا۔ تم نے اسے دلاسا دیا اور اس کا علاج شروع کر دیا۔ نوراں تندرست ہو گئی۔ مگر جب وہ ہسپتال سے رخصت ہونے لگی تھی تو یاد ہے، اس نے آہستہ سے تمہیں کہا تھا۔

”ڈاکٹر جی مجھے بچے کا غم کھا جائے گا۔“

اور نوراں کو اس کے بچے کا غم کھا گیا اور بوڑھے کوچوان کو نوراں کا غم کھا گیا اور تم۔۔۔۔۔۔

”یہ بکواس ہے۔“

یہ تم کیا کہہ گئے ہو ڈاکٹر؟ ۔۔۔۔۔۔۔ یہ بکواس ہی تو ہے۔ یہ فردوسی کا شاہنامہ نہیں ہے۔ یہ کالی داس کی شکنتلا نہیں ہے۔ یہ بیمار جین ہے یہ غم نصیب بالی ہے اور یہ مردہ نوراں ہے۔ یہ ویران خانقاہیں ہیں' جہاں رات کو الو بولتے ہیں اور دن کو کتے خاک اڑاتے ہیں۔ یہ مہیب کھنڈرات ہیں جین سے لے کر نوراں اور نوراں سے لے کر تمہاری بیوی تک ۔۔۔۔۔۔۔ سب بکواس ہے ۔۔۔۔۔۔۔ اس دریا کی تہہ میں بہت سی جل پریاں ہیں۔ یہ تمہارا دریا ہے جہاں پہنچ کر تم اپنی ہر نیکی کو غرقاب کر دیتے ہو۔ یہیں جین ڈوبی اور پھر بالی اور پھر نوراں اور پھر ۔۔۔۔۔۔۔

ڈائس پر نغمہ شروع ہے۔

اس میں کس قدر سکون اور ٹھہراؤ ہے۔ نغمے کی بے زبان لہریں بڑے پیار سے کانوں' ہونٹوں اور آنکھوں کو چومتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان میں ایک انوکھی کیفیت ہے ڈاکٹر ۔۔۔۔۔۔۔ اس خوشبو کی مانند جو بالی کے اوپر والے ہونٹ سے اٹھ رہی تھی اور جسے تم کوشش کے باوجود بیان نہیں کر سکتے تھے۔

یہ سب بکواس ہے ڈاکٹر

یہ مال کی چمکیلی سیج والی زرد دلہنیں ۔۔۔۔۔۔۔ یہ جلے بجھے سگریٹ ۔۔۔۔۔۔۔ اور ایسی ہی بکواس جین نے اس رات کی تھی جب وہ نشے میں چور تھی۔

”ڈاکٹر میں مریم ہوں' ناٹنگیل ہوں۔ میں نے آٹھ سال بیماروں کی خدمت کی ہے۔ جوزف مجھے چاہتا ہے۔ میں شعلے کی طرح پاک ہوں۔ میرے ڈاکٹر! میرے جوزف! ۔۔۔۔۔۔۔ مائی سن! مائی سن!!“

اور ۔۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر جی مجھے بچے کا غم کھا جائے گا۔

یہ نوراں کی بکواس تھی۔

اور تم بالی کے ساتھ اندر والے کمرے میں تھے۔ باہر دالان میں دیے کی لو کانپ رہی تھی۔ ایک طرف بالی کی بوڑھی ماں سوت کات رہی تھی۔ تکلیاں مدھم شور کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف اس کی کم سن بچی اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ اردو کی دوسری کتاب اس کے گھٹنوں پر تھی اور وہ ہولے ہولے سر ہلا ہلا کر پڑھ رہی تھی۔

تعریف اس خدا کی ۔۔۔۔۔۔۔

◆ ◆ ◆

ایک کہانی

اس نے چائے کا آخری گھونٹ پیا اور کھڑکی کی طرف آ گیا۔

یہ خزاں کے آخری دن تھے اور۔۔۔۔۔۔۔ شام کے جھٹپٹے میں کھلے آسمان کی نیلگوں چمک ماند پڑ رہی تھی۔ ساتھ والے کمرے سے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز آئی اور دوسرے لمحے اس کی چھوٹی بہن اندر داخل ہوئی۔ وہ میز پر سگریٹ کیس رکھ کر واپس چلی گئی۔ اس نے سگریٹ کیس جیب میں رکھا اور باغ میں سے ہوتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ گرد آلود سڑک، ڈوبتی شام کے دھندلکے میں دور تک خاموش اور ویران تھی۔ مدھم ہوا میں درختوں کے خشک پتے نرمی سے گر رہے تھے۔ ایک جگہ اسے کچھ دیہاتی لوگ خچروں پر مالٹے لادے قصبے کی منڈی کی طرف جاتے ملے اور اس نے فضا میں مالٹوں کی خشک خوشبو سونگھی۔

سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد وہ اپنی خالہ کے گھر کی طرف مڑ گیا۔

گھر کے برآمدے میں سے گزر کر جب وہ بڑے کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا خالہ کونے والی الماری کے نچلے خانے پر جھکی ہوئی تھی اور اس کا خالہ زاد بھائی خاور آتش دان کے پاس میز پر کہنیاں رکھے سر جھکائے کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا پائپ تھا جو شاید بجھ چکا تھا۔

”کہانی لکھ رہے ہو؟“

خاور نے سر اٹھایا اور پھر کہنیاں بھی اٹھا لیں اور پنسل ہاتھ سے رکھ دی۔ اس نے خالہ کو آداب کہا اور سگریٹ سلگا کر خاور کے پاس ہو بیٹھا۔

”ہاں، ایک کہانی لکھ رہا تھا۔“

”ضرور لکھو، یہ ایک دلچسپ کام ہے۔ خصوصاً جب کوئی کام نہ ہو۔“

خاور نے شرما کر کاپی بند کر لی اور پائپ صاف کرنے لگا۔ چھوٹے دروازے کا پردہ خود بخود سرک گیا اور مریم اندر داخل ہوئی۔ خوبصورت گردن اور بھورے سے بالوں والی نازک سی لڑکی، جسے پٹرول کی بو اور صبح کی چائے پر رس بھری کا مربہ بہت پسند تھا۔

اس نے قدرے جھک کر مریم کو سلام کیا۔ اگرچہ یہ حرکت احمقانہ تھی لیکن وہ ہر خوبصورت شے کا گرویدہ تھا اور اس کی تعظیم میں

جھک جانا چاہتا تھا۔

"آپ کے دوست نہیں آئے؟"

مریم کی آواز اس کے جسم کی مانند لوچدار اور نرم تھی۔ اس نے سوچا اپنے بھائی کے دوستوں کی بابت کیوں پوچھ رہی ہے؟ کیونکہ وہ ہر کسی کی خاطر یونہی سوچ میں کھو جانا پسند نہیں کرتا تھا اس لیے وہ خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ خاور بولا۔

"آ رہے ہوں گے۔"

خاور نے پائپ روشن کیا اور کمرے کی ٹھہری ہوئی فضا میں بڑھیا قسم کے تمباکو کی دھیمی دھیمی خوشبو پھیل گئی۔ اس کی خالہ الماری کے نچلے خانے سے چائے کا ڈبہ نکالتے ہوئے بولی۔

"کہو شام کیسی ہے؟"

"بے حد حسین"

اس نے مریم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو کھڑکی کے پاس آرام کرسی پر بیٹھی ہوئی شال بن رہی تھی اور سگریٹ راکھ دان میں مسل دیا۔ اچانک باہر احاطے کے باغ میں باتوں اور قہقہوں کی بہت سی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ نزدیک آتے ہوئے یہ آوازیں برآمدے کے پاس آ کر رک گئیں۔

"تمہارے دوست خاور"

مریم نے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ خاور کھڑکی کی طرف لپکا اور پھر وہیں کھڑے کھڑے مسکرانے لگا۔

"اگرچہ میری گھڑی خراب ہے پر بھی ہم وقت پر آ گئے ہیں۔"

یہ آواز باہر سے آئی تھی اور بے سری تھی۔ وہ خاور کے ہمراہ برآمدے میں آ گیا اور وہاں ایک شور سا مچ گیا۔ جس میں وہ بے سرا آواز بار بار بلند ہو رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کوئی شریر لڑکا پیانو کے پردوں پر غلیل کے نشانے باندھ رہا ہے۔

کھلے اور کم سجے ہوئے برآمدے میں پہنچ کر سب بیٹھ گئے۔ کوئی قالین اور کوئی صوفے پر۔ وہ کل پانچ تھے۔ دو شاعر ایک نقاد ایک گویا اور ایک آدمی ------- محض آدمی۔ شاعر اور نقاد قالین پر تھے اور گویا دو آدمی صوفوں پر۔ ایک شاعر نے فاختائی رنگ کا نیم گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے بال لمبے اور سنہری تھے۔ اور وہ دونوں گھٹنے جوڑ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دائیں ہاتھ کی انگلیاں بالوں میں پھیر لیتا اور ہر ختم ہونے والے سگریٹ سے تازہ سگریٹ سلگا لیتا تھا۔

دوسرا شاعر سپید سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کی پیشانی تنگ، بال لمبے اور آنکھیں شربتی تھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب قسم کی شرارت آمیز چمک نمایاں تھی۔ وہ شاعر تھا۔ مگر اس کی باتیں بالکل غیر شاعرانہ تھیں۔ جیسے وہ شعر کہنے کی بجائے کسی کارخانے میں خراد کا کام کر رہا ہو۔ وہ اپنی ہر بات کا ہنس ہنس کر لطف اٹھاتا تھا اور کسی وقت دوسروں کو ہنستا چھوڑ کر خود سب سے الگ جا کھڑا ہوتا تھا جیسے اس کا قہقہوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ قہقہے جو اس کی گرہ سے نکالے گئے تھے۔ وہ ہر تازہ سگریٹ دیا سلائی سے سلگاتا تھا۔

گویا تیکھی ناک، گندمی رنگت اور بھاری جسم کا آدمی تھا۔ اس کے گہرے سیاہ بال اس قدر گھنگریالے تھے کہ بناوٹی معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں دو پیالوں کی مانند تھیں اور نقاد کے خیال کے مطابق یہ پیالے چھنی ہوئی بھنگ سے لبریز تھے۔ وہ ہر بات شروع کرنے سے پیشتر ہنسنا شروع کر دیتا تھا جس طرح ریل گاڑی روانہ کرنے سے پہلے سگنل گرا دیا جاتا ہے۔

نقاد چھوٹے قد کا بوجھل سا آدمی تھا جو خاور کے قریب بیٹھا اپنے ساتھیوں سے اس انداز میں گفتگو کر رہا تھا جیسے اس گھر میں صرف ایک مہمان ہے اور باقی لوگ اسے محض وہاں تک چھوڑنے ہی آئے ہوئے ہیں۔ اس کا چہرہ کشمیری سیب کی مانند گول تھا اور یہ سیب ہنستے ہوئے زیادہ گول ہو جاتا تھا۔ اس کا مطالعہ وسیع اور دماغ بڑا چھوٹا سا تھا۔ اس کی الماریاں موٹی موٹی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر اس کا ذہن اس پتے کی طرح کا تھا جس پر شبنم کے قطرے کبھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی نئی کتاب خرید لیتا۔ ہر نئی کتاب جو وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ ساتھ رہتی اور تیسرے روز وہ کسی الماری میں پہنچ جاتی اور چوتھے روز وہ اسے بالکل بھول جاتا۔

وہ بڑے انداز سے ناک صاف کرنے اور سگریٹ پینے کا عادی تھا۔ پانچواں آدمی ------- محض آدمی، کچھ بھی نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا۔ اسے گویے سے محبت تھی اور وہ اس کی ہر بات کی نقل کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کی باتیں دلچسپ کم اور احمقانہ زیادہ تھیں۔ پھر بھی وہ زیادہ بولنے اور کم سوچنے کا عادی تھا۔ اس کی ہر حرکت، بیٹھنا، چلنا، سگریٹ جلانا، سگریٹ پینا، بولنا، مسکرانا ------- سب کچھ کسی نہ کسی ایکٹر سے ادھار مانگا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ نینا کی مانند بات بات پر شرمانے لگتا تھا۔ اس طرح اس کی شخصیت میونسپل کمیٹی کے اس نوٹس بورڈ کی مانند تھی جس پر قسم قسم کے اشتہارات چسپاں ہوں۔ وہ اپنی ہر بات پر گویے کو ہنسانا چاہتا تھا اور اگر کسی وقت گویا ہنسنے سے انکار کر دیتا تو اسے الجھن سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ پھر وہ معشوقانہ شعر پڑھ دیتا تھا۔ جس پر گویا شرم سے دوہرا ہو جاتا تھا۔ مگر یہ شرم اسے بڑی بے شرمی سے ننگا کر دیتی اور وہ کوئی فاحشہ عورت دکھائی دینے لگتا۔

خاور نے نقاد کے کان میں کچھ کہا اور اٹھ کر پچھلے کمرے میں نکل گیا۔ نقاد نے بوجھل جسم کی ایک سست حرکت کے ساتھ کوٹ کی

اندرونی جیب میں سے مگر مچھ کی کھال کا ایک بٹوہ نکالا اور اس میں سے کچھ ڈھونڈنے لگا۔ شربتی آنکھوں والے شاعر نے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ سنہری بالوں والا شاعر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

گویا بولا۔

"بڑا قیمتی بٹوہ ہے۔"

نقاد جھٹ بول اٹھا۔

"بڑا خونخوار مگر مچھ تھا۔"

نقاد نے بٹوہ زمین پر پھینک دیا اور کاشمیری سیب کا رنگ زیادہ سرخ ہو گیا اور اس نے مگر مچھ کے شکار کا قصہ چھیڑ دیا۔ دونوں شاعر اس قصے کو تیسری بار سننا برداشت نہ کر سکے اور ایک دوسرے کو سرگوشیوں میں اپنے پرانے شعر سنانے لگے۔ جب نقاد قصہ ختم کر چکا تو اس نے بٹوہ جیب میں رکھنا چاہا مگر معاً اسے خیال آیا کہ ابھی ایک آدمی کو مگر مچھ کے شکار کی بابت ہوئی کوئی علم نہیں' چنانچہ بٹوہ خاور کے انتظار میں قالین پر ہی پڑا رہا۔ شربتی آنکھوں والا شاعر اپنا سر دوسرے شاعر کے زانوں پر رکھ کر لیٹ گیا۔ کسی وقت وہ پچھلے دروازے والے پردے کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے ایکا ایکی کسی انوکھی شے کے نمودار ہو جانے کا یقین ہو۔ نقاد نے دو مرتبہ اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر سر جھکا کر ایک کتاب کے مطالعے میں ڈوب گیا۔ پانچواں آدمی گویے کے گھنگھریالے بالوں کی چمک سے مرعوب ہو کر اپنے بالوں کے متعلق غور کرنے لگا جو سرکنڈوں کی مانند تھے۔ دروازے والا پردہ بے معلوم انداز میں ہلا اور گویے نے اسی وقت اپنا ایک خاص پوز بنا لیا اور اس کا عاشق اپنے محبوب کو اچانک خوبصورت ہوتے دیکھ کر مبہوت سا ہو گیا۔ سنہری بالوں والا شاعر ختم ہوتے ہوئے سگریٹ سے تازہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ شربتی آنکھیں دفعتاً چمک اٹھیں اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیار حبیب

نقاد آگے ایک لفظ نہ پڑھ سکا۔ اس نے کتاب بند کر دی اور بٹوہ اٹھا لیا۔ معاً اس نے محسوس کیا کہ مگر مچھ زندہ ہو رہا ہے اور جب اسے بٹوہ رکھنے کی کوئی جگہ دکھائی نہ دی تو وہ پھر قالین پر آ گیا اور مگر مچھ کی کھال چمکنے لگی۔

شربتی آنکھوں والے شاعر نے دوسرے شاعر سے اطلاعاً کہہ دیا کہ رات وہ ایک نظم کہنے والا ہے جس کا آخری بند ابھی تیار ہو گیا ہے۔ سنہری بالوں والے شاعر نے مسکرا کر بالوں میں انگلیاں پھیریں اور اس کے ذہن میں اپنی ہونے والی نظموں کے آخری بند

تیرنے لگے۔ نقاد پھر مطالعے میں ڈوب گیا۔

گویے نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے نقاد کی طرف دیکھا۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کی آنکھوں کو بھنگ آلود کہا کرتا ہے۔ ایک لمحہ کے لیے اسے نقاد سے نفرت ہوگئی۔ اس نے پہلو بدل لیا۔ اچانک شربتی آنکھوں والا شاعر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور نقاد نے جھٹ کتاب بند کردی۔

”کیا بات تھی بھئی‘ ہمیں بھی ہنساؤ۔“

اس پر اور قہقہے بلند ہوئے مگر پانچواں آدمی بالکل نہ ہنسا‘ جیسے وہ کمرے میں بالکل تنہا بیٹھا ہو۔

پچھلے دروازے کا پردہ ہٹا اور خاور اندر آگیا۔ اس نے ہارمونیم اٹھایا ہوا تھا۔ گویا شرما سا گیا۔ اس نے ہارمونیم کھولا اور کچھ دیر بعد گانا شروع کردیا۔ اس کی آواز پرسوز اور انداز احمقانہ تھا۔ وہ منہ لٹکائے‘ آنکھیں چڑھائے‘ اپنی نازک کلائی کو فضا میں ناگن کی طرح لہرا لہرا کر گا رہا تھا۔ وہ کبھی آنکھیں بند کرلیتا اور کبھی یوں چپ ہو جاتا جیسے گانا ختم ہوگیا ہو۔ وہ ایک مرتبہ چپ ہوا اور پھر اس نے ہارمونیم آگے بڑھا دیا۔ تمام چہرے بیک وقت گویے کی جانب اٹھے اور تمام کے تمام سوجے ہوئے سے تھے۔ جیسے گویے نے انہیں شدید لعن طعن کی ہو اور اس کے خلاف رنج و غصہ سے بھرے ہوئے ہوں۔

اس کے بعد شربتی آنکھوں والے شاعر نے ایک نظم شروع کردی جس میں ایک طوائف سے ملاقات کا ذکر تھا۔ جب وہ اس کی درد بھری کہانی سن کر آبدیدہ ہوگیا تھا اور پھر آنکھیں پونچھ کر اس کے ساتھ ہی سو گیا تھا۔ اب سنہری بالوں والے شاعر کی باری تھی۔ اس نے سگریٹ کو بجھتا دیکھ کر تازہ سگریٹ سلگایا اور ایک غزل پڑھ ڈالی۔ جس کے مقطع میں اس کا تخلص دو مرتبہ آگیا تھا۔ نقاد نے جھٹ اعتراض کردیا۔

”لیکن اس میں آپ کا نقصان کیا ہے؟“ سنہری بالوں والے شاعر نے پوچھا۔

اور جب نقاد نے محسوس کیا کہ اس کا واقعی کوئی نقصان نہیں ہو رہا تو وہ چپکے سے کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ خاور پانچویں آدمی سے باتیں کرنے لگا۔ شربتی آنکھوں والے شاعر نے پردے کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں بندسی ہونے لگیں۔ اس نے سوچا‘ کاش وہ تنہا ہوتا۔ پردہ آہستہ آہستہ ایک طرف سرک جاتا اور کوئی دبے پاؤں اس کے قریب آ کر اس کی آنکھوں پر اپنے نرم گرم ریشمی ہاتھ رکھ دیتا اور فضا خوشبوؤں میں بس جاتی۔ اسے ایک تسکین بخش خنکی آنکھوں کے راستے اپنے سارے جسم میں پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر دوسرے شاعر کی طرف دیکھا۔ دوسرا شاعر کچھ گنگنا رہا تھا۔ اس نے غور سے سنا تو وہ

شاعر اپنی غزل کا مقطع پڑھ رہا تھا جس میں اس کا تخلص دو مرتبہ آتا تھا۔

پھر وہاں چائے آ گئی اور وہ سب ہنسی اور باتوں کے درمیان چائے پینے اور کیک کھانے لگے۔ کمرہ چائے اور تمباکو کی ملی جلی خوشبو سے لبریز ہو گیا۔ چائے کے بعد وہاں تھوڑی دیر کے لیے ایک پرسکوں خاموشی چھا گئی۔ خاور پائپ پینے لگا۔ گویا سگریٹ بجھا کر آنکھیں ملنے لگا۔ پانچویں آدمی نے بھی آنکھیں ملنا چاہیں مگر وہ رک گیا اور سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں کھو گیا۔ شربتی آنکھوں والا شاعر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ برآمدے کے سنگین فرش پر اس کے مدھم قدموں کی چاپ بتدریج ڈوب گئی۔ نقاد نے پہلو بدلتے ہوئے نئے ادب پر باتیں شروع کر دیں' جس میں سبھی شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ بڑی آسانی سے اپنے اپنے مضمونوں اور شعروں کے حوالے دینے لگے۔ نقاد نے جیب سے ایک مضمون نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مضمون کا ایک حصہ اس نے پوری توجہ سے سنا مگر وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس وقت کسی اصطبل میں بند رہا ہو۔ وہ جلدی سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔ باغ میں آتے ہی خنک ہوا کے نرم ہونٹوں نے اس کا منہ چوم لیا۔

باہر اندر کی نسبت ہر شے مختلف تھی۔ پہلے پہل اسے اندھیرے میں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ وہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے اس روش پر چلنے لگا جو مکان کے پچھواڑے سے ہو کر باورچی خانے کی طرف نکل گئی تھی۔ درختوں پر سے گرے ہوئے خشک پتے اس کے قدموں تلے چرچرانے لگے۔ بے معلوم انداز میں باغ کی ہر شے اندھیرے میں سے جھلکنے لگی۔ نیلگوں آسمان پر کافوری ستاروں کے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے۔ اسے اپنے چہرے پر نمی سے محسوس ہو رہی تھی جیسے خاموش اور نیم چمکیلی رات کا نور اوس بن کر گر رہا ہو۔ باورچی خانے کا دروازہ بند تھا اور دود کش ٹھنڈ ہو چکا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے اس نے پیاز اور لہسن کی ملی جلی بو سونگھی۔ ذرا آگے جا کر وہ برساتی نالے کے ایک پتھریلے پل پر بیٹھ گیا۔ نالے میں پانی کی جگہ دلدل تھی اور خشک پتے۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور چپ چاپ رات اور خاموش درختوں کی بے زبان گفتگو سننے لگا۔ دفعتاً مشرقی آسمان پر ملائم اور ٹھنڈی چمک کا ایک غبار سا پھیل گیا اور پھر ناشپاتی کی ننگی ٹہنیوں میں سے گول گول سرخ سرخ چاند ابھرنے لگے۔ وہ مسحور سا ہو گیا اور اس کا انہماک زیادہ گہرا ہو گیا۔ جیسے وہ کسی لنگر کے سہارے خاموشیوں کے گہرے پانیوں میں اتر گیا ہو۔ وہ ایک بت کی طرح پل پر بیٹھا تھا اور پراسرار چاند کی اولین طلائی کرنیں پیار سے اس کا منہ چوم رہی تھیں۔ وہ ہر شے کو ننگا کر رہی تھیں اور ہر شے عریاں ہو کر نزل سی لگ رہی تھی۔

اس کا جی چاہا وہ بازو پھیلائے اوپر کو اٹھے اور چاند کی طرف اڑتا جائے' اڑتا جائے۔ یہاں تک کہ چاند اس کے پیچھے رہ جائے۔ ستارے اس کا ساتھ چھوڑ دیں اور اس کا سفر کبھی نہ ختم ہو' اس کی منزل کبھی نہ آئے۔

اس نے بازو کھول کر ایک لمبی اور صحت مند انگڑائی لی اور اس کا مضبوط جسم ایک پر سکون لذت میں ڈوب کر گرم ہو گیا۔ وہ اٹھا اور سگریٹ پھینک کر والہانہ انداز میں چاند کی طرف بڑھنے لگا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ وہ باغ کی پشت پر اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کے اردگرد ناشپاتی کے درخت تھے جن کی شاخوں پر رہے سہے پتوں کا رنگ شرابی ہو رہا تھا۔ چاند ہولے ہولے بلند ہو رہا تھا اور اس کی دھندلی روشنی میں باغ کی ہر شے پہلے سے زیادہ سوگوار نظر آنے لگی تھی جیسے اس نے محفل میں آتے ہی کوئی دردناک داستان چھیڑ دی ہو۔ کھیلوں والے پلاٹ کی سمت مڑتے وقت اس کے قدم خود بخود رک گئے اور وہ جلدی جلدی سے ترشے ہوئے پودوں کی دیوار میں آ گیا۔ اس نے قدرے جھک کر شاخوں میں سے دوسری جانب دیکھا' کھلے پلاٹ میں چاندنی کی سیج بچھی ہوئی تھی۔ ایک جگہ لیموں کے درخت تلے ایک سنگین بنچ پر مریم اور شربتی آنکھوں والا شاعر ایک دوسرے پر جھکے ہوئے تھے۔ درخت کی شاخوں پر سے پھسلتی ہوئی نیلگوں چاندنی کا نور ان پر آبشار کی مانند گر رہا تھا۔ دونوں کے سپید اور بے داغ لباس ایک دوسرے سے مل گئے تھے اور یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے کسی مالن نے گجرے تیار کرنے کے لیے بنچ پر موتیے کے پھولوں کا ڈھیر لگا دیا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک مسرت انگیز چمک پھیل گئی۔ گویا وہ کائنات کی کسی حسین ترین شے کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

اس نے سگریٹ پینا چاہا مگر رک گیا۔

دوسری روش پر سے گزرتے ہوئے اس نے مریم کے نقرئی قہقہے کی آواز سنی جو پر سکوں رات کی تنہائی میں اسے بے حد غمگین محسوس ہوئی۔ وہ زیر لب مسکرا دیا۔ باورچی خانہ کے پاس اسے پھر پیاز اور لہسن کی بو آئی۔ درختوں پر سے خشک پتے بدستور گر رہے تھے۔ مکان کے قریب پہنچ کر اس نے دیکھا کہ برآمدے کی روشنی بجھ چکی تھی اور خاور کے دوست جا چکے تھے۔ صرف اس کے پچھلے کمرے کی بتی روشن تھی۔

وہ کھڑکی میں سے اندر جھانکا۔

خاور آتش دان کے پاس بیٹھا کہانی لکھ رہا تھا۔

◆◆◆

خلیج

میں اس چھوٹے سے اسٹیشن پر تنہا ہوں۔

میں نے پھر اس لڑکی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے جسے میں نے گوجرانوالا اسٹیشن پر دیکھا تھا اور جس کے متعلق میں یہاں تک سوچتا آیا ہوں اور یہاں نہ رہ جاتا تو لاہور تک سوچتا جاتا۔ مگر میں آج لاہور نہیں جاؤں گا۔

گوجرانوالہ اسٹیشن پر لاہور جانے والی بابو ٹرین تیار کھڑی تھی۔

میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں پلیٹ فارم پر پھر رہا تھا کہ ایک زنانہ ڈبہ کے پاس سے گزرتے ہوئے میری نظر اس لڑکی پر جا پڑی۔ ڈبہ بچوں' عورتوں اور چھوٹے بڑے صندوقوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے برتھ کی زنجیر تھام رکھی تھی اور دوسرا ہاتھ صندوقوں کے ایک ڈھیر پر تھا۔ اس کے دونوں بازو یوں اٹھے ہوئے تھے جیسے وہ اڑنے کے لیے پر تول رہی ہو۔ اس کا پیازی رنگ کا دوپٹہ اس کے سینے پر ڈھلک آیا تھا اور لمبے لمبے بال شانوں پر تقریباً کھلے ہوئے تھے۔ سیاہ بالوں اور پیازی رنگ کے دوپٹے کے درمیان اس کا بھولا بھالا زردی مائل سفید چہرہ بڑا پیارا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں ٹھٹک گیا۔ مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میں یسوع مسیح کی تصویر دیکھ رہا ہوں جس میں انہیں صلیب پر کھینچے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کی نازک گردن نیلوفر کے ڈنٹھل کی مانند تھی جس پر نیلوفر کا معصوم پھول ڈبے کی محبوس فضا میں کملا رہا تھا۔ میں ایک سچا عیسائی بنا مصلوب مسیح کو عقیدت اور محبت سے دیکھ رہا تھا کہ میرے ساتھیوں نے مجھے ڈھونڈ لیا اور ہم ایک ڈبے میں گھس گئے۔ انجن نے آخری سیٹی دی اور گاڑی چل پڑی۔

میرے ساتھیوں میں سے شیخ غلام کف گیر کی عمر چالیس سے کچھ اوپر تھی' اس نے جیب سے عینک کیس نکالا۔ اس کا غلاف بے حد گندا ہو رہا تھا۔ پکوڑا سی ناک پر بھدے شیشوں والی عینک جمائی۔ کیس کے غلاف کو خشخشی ڈاڑھی کے برش سے رگڑ کر صاف کیا' کوٹ کی اندرونی جیب سے حمائل شریف نکالی اور تلاوت شروع کر دی۔

بدتمیز خان نے احتراماً سگریٹ بجھا کر جیب میں رکھ لیا اور اپنے ساتھ والے موٹے مسافر کی گنجی چندیا کو بڑے اہتمام سے گھورنے لگا۔

قہر الٰہی میرے قریب بیٹھا ''خوفناک بھونچال عرف مایا کا جال'' پڑھ رہا تھا۔ اس کی پوری کھلی ہوئی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی اور چوڑے نتھنے حسب عادت تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پھڑک رہے تھے۔ جیسے وہ مایا کے جال میں پھنسی ہوئی مچھلیوں کی بو سونگھ رہا ہو۔

ایس کریم بخش، شیخ غلام کف گیر کے پاس بیٹھا بڑے ٹھنڈے دل سے کل کا تازہ اخبار پڑھ رہا تھا۔

بیمار بخت اور خوش علی کونے والی نشستوں پر آمنے سامنے بیٹھے عبرتناک نگاہوں سے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ وہ دونوں میو ہسپتال کے دفتر میں ملازم تھے۔

ایمن آباد کا اسٹیشن گزرتے ہی جیسے میرے ساتھیوں کی کایا پلٹ گئی۔ شیخ غلام کف گیر نے تلاوت کرنے کے بعد دعا مانگ کر حمائل شریف اندرونی جیب میں رکھ لی اور دوسری جیب سے میلی سی تاش نکال کر اسے چالاک پتے بازوں کی مانند پھینٹنے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔

بدتمیز خان نے بجھا ہوا سگریٹ دوبارہ سلگا لیا۔ قہر الٰہی نے ایک خوفناک قہقہے کے ساتھ 'مایا کا جال' تہہ کر کے جیب میں ڈالا اور آئس کریم بخش کو رومال نکالنے کا حکم دیا۔ اس نے کل کا تازہ اخبار دوسری طرف سرکا دیا اور جیب سے بڑا سا سرخ رومال نکال کر ہمارے گھٹنوں پر پھیلا دیا اور غلام کف گیر نے تاش بانٹنا شروع کر دی۔

بیمار بخت اور خوش علی بھی آگے سرک آئے اور انکی بوٹ پر پریل شروع ہو گئی۔

ہم اگرچہ بلاٹکٹ سفر کرتے تھے لیکن ہمیں سوائے قریشی گروپ کے عام ٹکٹ چیکروں کی کوئی پروانہ تھی کیونکہ ہم چلتے جوئے میں سے کچھ نہ کچھ ان کی نظر کر دیتے تھے۔ مگر خفیہ پولیس کے آدمی بڑے طوطا چشم تھے۔ بلکہ ان میں سے بہتوں کی شکلیں بھی طوطوں ایسی ہی تھیں۔ وہ ہم سے کھاتے پیتے بھی تھے اور اکثر اوقات عین جمے ہوئے کھیل کے دوران میں دھاندلی بھی مچا دیتے تھے۔ قہر الٰہی اور بدتمیز خان ان کے لیے ماڈرن قسم کی گالیاں تیار رکھتے تھے۔

گاڑی اڑی جا رہی تھی اور سرخ رومال میرے گھٹنوں پر سے کھسک رہا تھا۔ میں نے اسے اچھی طرح اوپر کر لیا۔ رومال میں آنے دوانیاں اور سگریٹ کی راکھ جمع ہو رہی تھی اور پتے بڑی گرم جوشی کے ساتھ ماں بہن کی گالیوں کے ساتھ نیچے گر رہے تھے۔

گاڑی کی رفتار بے ہنگم تھی اور ڈبے میں ہر شے بری طرح ہل رہی تھی' تاش کھیلنے والوں کے ہاتھ' گھٹنے' قہر الٰہی کے نتھنے اور مسافروں کے سر اور چھت سے لٹکتی ہوئی تھیلیاں۔۔۔۔۔۔ اور میں نے سوچا' کچھ ڈبے چھوڑ کر اس زنانہ ڈبہ میں اس لڑکی کا جسم بھی ہل رہا ہوگا'

جھوم رہا ہوگا' ناشپاتی کے چھریرے درخت کی مانند۔۔۔۔۔۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے بازوؤں کا گوشت تھرک رہا ہوگا اور اس کے سینے پر ڈھلکا ہوا پیازی دوپٹہ۔۔۔۔۔۔ میں نے یونہی اس لڑکی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ عورتوں' بچوں اور صندوقوں سے بھرے ہوئے اس ڈبے کے ایک کونے میں صلیب بنی کھڑی تھی اور میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اگر وہ لاہور تک اسی طرح کھڑی رہی تو لاہور تک اس کی ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو جائیں گی۔ اس کے اوپر اٹھے ہوئے بازوؤں کا خون نیچے سمت آئے گا۔ نازک ڈنٹھل ایسی گردن پر نیلوفر کا پھول مرجھا جائے گا اور اس کی آنکھوں میں تھکن کا شدید احساس دھند بن کر۔۔۔۔۔۔۔ دھند' جالا' ککرے' موتیا۔۔۔۔۔۔

یہ آواز ڈبے میں دروازے کی طرف سے آئی تھی۔

اونگھتے ہوئے مسافروں کے کانوں میں یہ سخت آواز گرم سلاخوں کی مانند گھس گئی اور انہوں نے گردنیں جھٹک کر دروازے کی طرف دیکھا جہاں میلے کپڑوں اور دھندلی آنکھوں والا مریل سا آدمی مسافروں کو گھور رہا تھا۔

"پتہ نہیں سالا ہمارے ڈبے میں کیوں آ جاتا ہے؟"

بدتمیز خان نے پان کی ٹھی پھینکتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ بات درست تھی۔ اسے ہمارے ڈبے میں آ کر بلا ناغہ دھند' موتیا' ککرے اور جالا پھیلانے کا کوئی حق نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ہر روز ہمارے ڈبے میں آ نمودار ہوتا ہے۔

وہ کہہ رہا تھا۔

"سریں کا ڈنڈا۔۔۔۔۔۔۔ ادھر دیکھئے زناب' کوئی دو اانچ موٹا اور تین فٹ لمبا ڈنڈا لے کر اس کے عین درمیان میں سوراخ کر دیں۔ اس سوراخ میں دوائی بھر دیں اور پھر اس کے دونوں سروں پر اپلوں کی آگ جلا دیں اور زناب' ذرا اپنی "پاخوں" سے خبردار رہیں۔ جب وہ دوائی سریں کے پانی میں پک جائے تو اسے باہر نکال لیں۔ پھر اس میں پانچ تولے نمک کا تیزاب اچھی طرح حل کر لیں اور بلا ناغہ صبح اٹھ کر آنکھوں میں لگائیں۔ اگر میرے مولا کی مرضی ہوئی تو پہلے ہی روز آنکھیں گلاب کا پھول بن جائیں گی اور دھند' جالا' ککرے۔۔۔۔۔۔۔"

مسافروں نے اپنی اپنی آنکھیں جھپکا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے انہیں ڈر ہو کہ کہیں ان کی آنکھوں میں بھی دھند اور جالا نہ پھیل جائے اور انہیں بھی سریں کے ڈنڈے نہ کاٹنے پڑیں۔

میرے ساتھی شور مچاتے' گالیاں بکتے' سگریٹ پھونکتے پریل کھیل رہے تھے اور گاڑی بھاگی جا رہی تھی اور میں سرخ رومال

آنے دونیاں اور سگریٹوں کی راکھ لیے مسلسل ہل رہا تھا۔

میں نے سوچا اگر وہ لڑکی اسی طرح کھڑی رہی تو اس کے جسم کی ساری رگیں اکڑ جائیں گی اور اس کے بازو نیم جان ہو کر نیچے گر پڑیں گے۔ اسے کہیں نہ کہیں ضرور بیٹھ جانا چاہیے ------- کسی جگہ بھی ------- کسی عورت کو پرے کھسکا کر ------- عورتوں کے ڈبے میں تو وہ جہاں چاہے اپنے لیے جگہ بنا سکتی ہے۔ میرے خیال میں وہ موٹی عورت اگر ذرا کھسک جائے تو تین لڑکیوں کے لیے جگہ پیدا ہو سکتی ہے۔

"محترمہ آپ ذرا اکٹھی نہیں ہو سکتیں؟"

"چل وے منڈیا!"

"معاف کیجیے گا میں کہیں نہیں جا سکتا۔"

"آیئے محترمہ! آپ میری جگہ بیٹھ جائیں' میں اٹھ جاتا ہوں۔"

اور میں اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ ہی سرخ رومال بھی اوپر اٹھ آیا اور تاش کے پتے اور آنے دونیاں فرش پر لڑھک گئیں۔

"بیڑا غرق کر دیا ------- کیا ہوا ہے تمہیں؟ اب ہم ماں کا سر لگائیں یہاں؟"

میرے ساتھی میرے اچانک اور بے موقع کھڑے ہونے پر مجھے غصہ سے گھور رہے تھے۔ میرا سر اوپر برتھ سے ٹکرا گیا تھا۔ میں ندامت کے احساس سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور اپنا سر سہلانے لگا۔ سرخ رومال پھر ہمارے گھٹنوں پر پھیلا دیا گیا اور تاش کے پتے پھر اسی گرم جوشی سے گرنے لگے۔ بھلا مجھے کیا پڑی تھی کہ میں نے اپنی جگہ اس ناواقف لڑکی کے لیے خالی کر دی۔ یہ کام تو اس کے خاوند کا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے اس لڑکی کا کوئی خاوند ہی نہ ہو۔ شاید وہ ابھی تک کنواری ہو۔

کاش میں اس کا خاوند ہوتا۔ اگر میں اس کا خاوند ہوتا تو -------

تو ہم آج لاہور جاتے ہی نہ

بھلا اس قدر رش اور گرمی میں سفر کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ (اگر مریم اس کا نام ہوتا تو) اگر مریم اصرار کرتی تو میں درجہ اول میں لاہور تک کے لیے دو نشستیں بک کرا لیتا۔ اور اگر درجہ اول میں کوئی نشست خالی نہ ہوتی تو میں فوراً گھر پر ڈرائیور کو فون کر دیتا کہ وہ گاڑی لے کر پہنچ جائے۔ اتنی دیر ہم کیفے اوریال کے باہر سفیدے کی پرسکوں چھاؤں والے صحن میں بیٹھ کر کولڈ ڈرنکس اڑاتے' موسم ایک دم خوشگوار ہو جاتا۔

آسمان پر بھورے بھورے بادل چھانے لگتے۔ ہمارے سروں پر سفیدے کی لمبی شاخیں ہوا کے لطیف جھونکوں میں جھومنے لگتیں۔ مریم کے ریشمی بال اس کے نیم سپید گالوں پر لوٹنے لگتے اور اس کی شفاف آنکھوں میں بہار کی تازگی جھلک اٹھتی۔ میں اس کی طرف جھک کر دھیمی آواز میں پوچھتا۔

"کچھ اور؟" مریم مسکرا کر کہتی۔

"شکریہ ڈارلنگ"

پھر ہمیں اپنے نیلے رنگ کی جہازی پیکارڈ' سینما کی عمارت کے قریب سے گھوم کر ریلوے روڈ پر اپنی طرف بڑھتی دکھائی دیتی۔ مریم تتلی کے پروں ایسی ساری سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوتی۔ گاڑی بے معلوم آواز میں ہمارے پاس رک جاتی۔ ڈرائیور آہستہ سے پچھلی نشستوں کا دروازہ کھول دیتا۔ ہم اندر بیٹھ جاتے اور ہماری پیکارڈ لاہور کی سمت روانہ ہو جاتی۔

نشست کے نرم گدیلوں میں ڈوبی ہوئی مریم اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر پوچھتی۔

"ہم کس وقت پہنچیں گے ڈارلنگ؟"

"بہت جلد ڈارلنگ"

مریم کی پلکیں بڑی آہستگی سی آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک جاتیں اور ان جھیلوں کی پر سکوں سطح پر نیند کی ننھی منی پریاں اپنے رنگیں پر لہرا لہرا کر اترنے لگتیں اور مریم اپنا سر پیچھے لگا کر سو جاتی۔ سانس کے لطیف اتار چڑھاؤ میں اس کے حلق اور مرمریں سینے کے درمیانی حصے پر زمرد کا نکلس صبح کے تارے کی مانند جھلملانے لگتا۔ نیم وا ہونٹوں کے درمیان موتیوں ایسے دانتوں کی آبدار لکیر جھلک اٹھتی۔ یہ موتی' یہ ہیرے مجھے اپنے آپ پر علی بابا کا گمان ہوتا جو کھل جا سم سم کہنے کے بعد موتیوں بھرے غار کے منہ کو آہستہ آہستہ کھلتے دیکھ رہا ہو۔ میں غار کی طرف بڑھتا اور مریم کی آنکھ کھل جاتی اور غار کا منہ بند ہو جاتا۔

مریم کی خواب آلود آنکھیں اور نیند کی شبنم سے دھلے ہوئے پر سکوں چہرے پر تبسم کی لطیف لہریں پھیل جاتیں اور وہ مجھے پیار بھری نظروں سے تکنے لگتی پھر ہم باتیں کرنے لگتے۔

مریم پوچھتی۔

"ڈارلنگ تم نے ایمرسن پڑھا؟"

"ضرور پڑھا ہے' سویٹ ہارٹ"

''وہ ایک مضمون میں کہتا ہے کہ مہذب انسان نے موٹریں' ریلیں اور ہوائی جہاز ایجاد کیے اور اپنی ٹانگوں کا استعمال بھول گیا۔ گھڑی بنائی اور سورج سے وقت کا اندازہ کرنا بھلا بیٹھا۔ کیا یہ درست ہے ڈارلنگ کہ ایمرسن کے پاس گھڑی نہیں تھی اور وہ ریل میں سفر نہیں کیا کرتا تھا؟''

میں کہتا۔

''سویٹ ہارٹ۔۔۔۔۔۔ ان لوگوں کی باتوں کو چھوڑو یہ اصل میں جو کچھ سوچتے ہیں کبھی نہیں لکھتے اور جو کچھ لکھتے اس کے متعلق کبھی نہیں سوچتے۔ ان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ان کی کوئی بات یاد رکھنے کے قابل نہیں اور کوئی مقولہ قابل عمل نہیں۔ تم شا کا یہ مقولہ پلے باندھ لو کہ دنیا میں کوئی مقولہ نہیں ہے۔''

اس پر مریم کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور غار کا منہ کھل جاتا اور اندر ہیرے' موتیوں کے ڈھیر چمکنے لگتے۔ میں اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیتا۔ میرے ہونٹ ہیرے موتیوں کے ڈھیروں کی طرف بڑھتے اور علی بابا غار میں داخل ہو جاتا۔

ڈیڑھ گھنٹے کے خوشگوار سفر کے بعد ہماری پیکارڈ لاہور کی مال پر سے ہوتی ہوئی آم اور لیچیوں کے سایہ دار درختوں میں گھری ہوئی ایک خوشنما کوٹھی کے پورچ میں پہنچ کر رک جاتی۔ مریم وینٹی کیس میں سے پف نکال کر منہ پر کوئی پوڈر کی ہلکی سی تہہ جماتی۔ ڈرائیور دروازہ کھولتا اور وہ تتلی کے پروں ایسی ساری کا آنچل سنبھالتی میرے ہمراہ شہزادیوں ایسی شاہانہ چال سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتی۔ بتول اور زیتون ہمیں دوڑ کر ملتیں۔ ننھی زیتون مجھ سے لپٹ جاتی۔ بتول کہتی۔

''آپ کا تار ابھی ابھی ملا ہے۔''

''ابھی ابھی کیوں؟ وہ تو ایکسپریس تھا۔''

ہم ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھ جاتے۔ مریم بتول کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی جاتی اور زیتون مجھے بسکٹوں اور چاکلیٹ کا ڈبہ کھولتے دیکھ کر اطالوی طرز کے صوفے کے بازو پر چڑھ آتی۔

''آہا چاکلیٹ میں لوں گی' بسکٹ بتول باجی کو دیں گے۔''

''نہیں' ننھی شہزادی! آدھے چاکلیٹ تمہیں اور آدھے بتول باجی کو ملیں گے۔''

درمیانی دروازے کا جالی دار پردہ ایک طرف سرک جاتا اور مریم کی ادھیڑ عمر والدہ اندر داخل ہوتیں۔

''آداب امی جان!''

"جیتے رہو بیٹا۔" وہ میرا سر چوم لیتیں۔

"ابا جان کہاں ہیں؟"

"صبح سے خان بہادر کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔"

"وہاں کوئی پارٹی ہو رہی ہے کیا؟"

"ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ خان صاحب کی بڑی صاحبزادی امریکہ جا رہی ہیں ۔۔۔۔۔۔ بھلا وہ کیا بنائیں گی امریکہ جا کر۔"

کون ۔۔۔۔۔۔ رفعت امی جان؟"

"ہاں ہاں وہی ۔۔۔۔۔۔ جس نے مریم کی سالگرہ والی رات یہاں ڈانس کیا تھا۔"

"اچھی لڑکی ہے ۔۔۔۔۔۔ کیوں امی جان؟"

"یہ لڑکیاں ایک ہی آفت کی پڑیا ہوتی ہیں تم کہو۔ تمہاری امی کا کیا حال ہے۔ ابھی کو وہ مری ہی میں ہی کیا؟"

"جی ہاں، مگر میرا خیال ہے کہ مری سے انہیں کھیوڑہ بھیج دیا جائے۔"

"ارے لڑکو تم لوگوں کے ہوش بھی ٹھکانے ہیں کیا؟ بھلا مری کھیوڑہ کا کیا مقابلہ؟"

"ٹھیک ہے امی جان، مگر ڈاکٹر کہتے ہیں کہ مری کی ہوا میں نمک کی کمی ہے۔"

اور امی جان سر لٹکا کر کہتیں۔

"جب تو کھیوڑہ ہی ٹھیک رہے گا۔"

وکٹورین انداز کے آتش دان کے اوپر رکھی ہوئی میری تصویر مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتی۔

پردہ پھر سرکتا اور مریم بتول کے ساتھ اندر داخل ہوتی۔ اس نے ساری کی بجائے پھولدار وائل کی نارنجی قمیص عنابی رنگ کا ریشمی غرارہ اور نینوں کا جالی دار آنچل سینے پر ڈھلکایا ہوتا۔ اس لباس میں وہ پراسرار جزیروں کی حسین شہزادی معلوم ہوتی جو گہرے نیلے سمندروں کو عبور کر کے گلپوش مرغزاروں میں سیر کرنے نکل آئی ہو۔

چائے کی میز کے گرد بیٹھنے کے بعد بتول اپنا ہاتھ نقرئی کیتلی کی طرف بڑھاتی اور اس کا گلابی قمیص میں ٹھسا ہوا خوبصورت بازو یوکلپٹس کی شاخ کی مانند پھولدار پیالوں پر جھک جاتا اور گرم گرم سنہری اور خوبصورت چائے پیالی میں گرنے لگتی۔

مریم چائے میں شکر اور دودھ ملا کر پیالی میری طرف بڑھاتی۔

نوکر ایک بڑی سی بلوریں ٹرے میں ایک کیک اور مختلف قسم کے جاموں سے بھری ہوئی طشتری لیے داخل ہوتا۔ مریم کو آلوچے کا جام پسند ہے اور بتول تو انناس کے جام پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ بڑے شوق سے چمچہ بھر مربہ لیتی اور کیک پر لگانے لگتی۔ مریم دوسرے ٹکڑے پر جام لگا کر میری پلیٹ میں رکھ دیتی۔

"مجھے تو بھائی جان انناس کا جام بہت پسند ہے۔"

اور میں بتول کی گلابی جالی دار قمیص میں سے اس کے سپید بدن کی چاندنی کو چھن چھن کر نکلتے دیکھ کر کہتا۔

"مجھے بھی پسند ہے۔"

مریم مسکرانے لگتی۔ غار کا دروازہ تھوڑا سا کھلتا۔ موتیوں کے ڈھیروں کی ہلکی سی جھلک دکھائی دیتی اور غار کا منہ پھر بند ہو جاتا۔

چائے کے بعد مریم اطالوی پیانو پر جا بیٹھتی۔ بتول پیانو سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو جاتی۔ میں تھری کاسل سلگا کر خوشبودار تمباکو کے پرسکوں کش لینے لگتا اور بے تھیرون کے انتخاب میں سے نغمہ نو بہار پیانو کے لرزتے ہوئے سروں میں سے انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا۔ بتول کے پاس ہی چینی کے گلدان میں رکھی ہوئی نرگس کی ادھ کھلی زرد کلیاں جھومنے لگتیں اور بلجم کے قدیم قد آدم آئینوں، ریشمی جالی دار پردوں، اطالوی طرز کے صوفوں، ایرانی قالینوں والے اس کمرے میں بہار کی مدھم نغمگی والٹ ڈزنی کے رومانوی رنگوں کا روپ لے کر بکھر جاتی۔ آتش دان کے کونے پر رکھی ہوئی ریفائل کی تصویر "سحر" کے لمبے چھریرے اور نرم شاخوں والے درختوں کی کلائیوں پر رنگ برنگے پھولوں کے کنگن چمکنے لگتے اور ان کے عقب میں سے پھوٹتی سحر کا نور سورج کی سنہری شعاعوں میں تبدیل ہونے لگتا اور پیانو پر جھکی ہوئی بتول کی مرمریں جسم کی چاندنی میں نرگس کی ادھ کھلی کلیاں جیسے اپنی مدہوش پلکیں کھول دیتیں۔ جیسے ریفائل اپنی تصویر پر برش کے آخری ٹچ دے رہا ہو۔ جیسے ان کلیوں پر بہار کا جادو اوس بن کر ٹپک رہا ہو۔ جیسے صبح ہو رہی ہو اور ٹوٹی رات کے اڑتے، گھلتے، گم ہوتے سیاہ آنچل میں سے صبح کا نرم اور بے داغ اجالا جھانک رہا ہو۔

بہار--------بہار--------بہار!

پیانو کے آگے بیٹھی ہوئی مریم، بہار کی دیوی، نئی زندگی، نئے افق، نئے دور کا سندیسہ دے رہی ہے۔ یہ سندیسہ شبنم سے دھلے ہوئے پھولوں کی رنگین پتیوں پر لکھ کر بے تھیون نے وی آنا، پراگ اور لی پیزگ کی سرزمین سے بھیجا ہے۔ یہ ہائیڈل برگ کے چمکیلے خیابانوں میں، سایہ دار درختوں میں بہنے والی نیکر کا خرام ہے۔ یہ نطشے کے عظیم و جلیل خواب کی تعبیر ہے۔ یہ گوئٹے کی روح کی پکار ہے،

یہ شمال ہے‘ یہ جنوب ہے‘ یہ مشرق و مغرب ہے۔ یہاں زمین کی چاروں سمتیں ایک ہو جاتی ہیں۔ زردشت پہاڑوں کی سربفلک چوٹیوں پر پھوٹنے والے چشموں کے کنارے کم سن بچیوں کے درمیان آسمانی رقص میں محو ہے اور دھرتی کے بے نور سینے پر سے نور کے سوتے پھوٹ رہے ہیں۔ یہ تاریک سمندروں کے موتی اور گمنام جزیروں کے پھول ہیں۔

اے بہار کی دیوی! بدنصیب دھرتی کی بیٹی‘ تیری انگلیاں اس ساز کے لرزتے پردوں پر کبھی نہ رکیں۔ بجائے جا۔۔۔۔۔۔ تیرے نغموں میں سات سمندروں کی گہرائی اور وسعت ہے۔ ان انگلیوں کا لمس تیرے مردہ بچوں کی رگوں میں پھر سے زندگی کا خون دوڑا دے گا۔

تیری کلائیوں پر بہار کے پھول سدا لہلہاتے رہیں گے۔

تو نے اپنے بیٹوں کو ہمیشہ نغمات کے چھینٹوں سے جگایا ہے۔ کالی داس سے اقبال اور مہاتما بدھ سے مہاتما گاندھی تک ۔۔۔۔۔۔ تو ازل سے تھی اور ابد تک رہے گی۔

بہار ضرور آئے گی۔

رات کے تاریک ماتھے پر صبح کا جھومر ضرور لہرائے گا۔

صبح ہو گی‘ دن نکلے گا اور مشرق سے سونے کا جوالا مکھی پھوٹ بہے گا اور چہچہاتے ہوئے پرندے چمکیلے آسمان پر آزادانہ اڑان کے لیے اپنے گھونسلوں سے باہر آئیں گے اور تمام ندیوں کی رفتار تیز ہو جائے گی اور پھر۔۔۔۔۔۔

اور پھر مریم نے پیانو بند کر دیا۔ بتول چینی کے گلدان کے پاس جھکی رہی۔ ان کے چہروں پر بہار کی پہلی سحر ایسا نکھار اور پاکیزگی تھی‘ جیسے بے تھیون کے نغمات زندہ مجسموں میں ڈھل گئے ہوں۔ بتول نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ بہار کے پھول تھے۔ یہ ان پھولوں پر ڈھلکی ہوئی شبنم تھی۔ وہ جلدی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی اور میں نے مریم کے قریب جا کر ڈھل پر اگے ہوئے نیلوفر کے پھول کو ہاتھوں میں تھام لیا۔

”ڈارلنگ نغمہ کیسا تھا؟“

میں خاموش رہا۔ میں کیا کہتا؟ میرے پاس الفاظ نہ تھے‘ کوئی زبان نہ تھی۔ میں نے جھک کر نیلوفر کو چوم لیا اور میرے جسم میں بہار کا جادو گرم رو بن کر پھیل گیا۔ مریم دوسرے کمرے میں چلی گئی اور آتش دان کے اوپر رکھی ہوئی میری تصویر مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی۔ میں اطالوی صوفے پر بیٹھ کر تھری کاسل پینے لگا۔ اور میری تصویر مسکراتے ہوئے چاندی کے فریم سے باہر نکل کر قدم بہ قدم چلتے

ہوئے میرے قریب آ گئی اور مجھ سے سگریٹ کا کش مانگنے لگی۔ میں نے سگریٹ بڑھا دیا۔ اس نے تین چار لمبے کش لگائے۔ اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئی۔ سگریٹ بجھا کر وہ واپس مڑی اور اپنے فریم میں جا کر مجھے معنی خیز نگاہوں سے تکنے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں اس تصویر پر ہنستے ہوئے ایرانی قالین پر اپنی ٹانگیں پھیلا دیں۔

جونہی میں نے ٹانگیں پھیلائیں‘ گھٹنوں پر سے سرخ رومال نیچے کھسک گیا۔ تمام آنے دونیاں اور تاش کے پتے فرش پر لڑھک گئے اور پھر بیڑا غرق ہو گیا۔ قہر الٰہی نے مجھ پر قہر آلود نگاہ ڈالی۔

بدتمیز خان نے اپنا ہاتھ جوتی کی طرف بڑھایا۔ مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔

”پتہ نہیں سالے تمہارے نیچے پارہ لگا ہے۔“ شیخ غلام کف گیر نے خشخشی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

میرے نیچے پارہ بالکل نہیں تھا۔ لیکن میں اتنی برق رفتاری کے ساتھ کہاں سے کہاں آ گیا تھا۔ وہ ایرانی قالین اور اطالوی صوفہ کہاں تھا؟ بتول کہاں تھی؟ مریم کہاں تھی؟ وہ نغمات کا چشمہ‘ وہ فرانسیسی پیانو کدھر تھا؟

بحیرہ روم کے پرسکوں سمندروں میں غوطہ لگانے کے بعد میں ایکا ایکی خلیج انڈیمان میں نکل آیا تھا۔

”یہ رہی تیری ماں کی اٹھی۔“

بدتمیز خان نے زور سے پتہ پھینکا اور دونوں ہاتھوں سے چاندی کے سکے جیبوں میں ٹھونسنے لگا۔ پھر وہ مسرت سے نیم پاگل سا ہو کر ناچنے لگا اور ڈبے کے تمام مسافر حیرانی سے اسے تکنے لگے۔

یہ زردشت تھا جو پہاڑوں کی چوٹیوں سے پھسل کر رات کے تاریک کھڈوں میں بھوتوں کے درمیان ناچ رہا تھا۔ ریفائل اپنے شاہکار ”سحر“ کو چاقو سے پھاڑ کر اسے کیچڑ میں پھینک رہا تھا۔ یہ ہائیڈل برگ کے نیکر کا خرام نہیں تھا۔ یہ گیٹے کی روح کی آواز اور بےتھیون کا نغمہ بہار نہیں تھا۔ یہ کچھ اور تھا۔-------- کچھ اور --------

یہ نئی صبح کی سنہری کرن نہیں تھی بلکہ سیاہ دھوئیں کی منحوس لکیر تھی جو ایشیا کے مرمریں جسم پر بدنصیبی کا داغ بن کر اس افق سے اس افق تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک بدتمیز خان نہیں تھا جس نے چاندی کے سکوں کو جیب میں ٹھونس کر بھوتوں کی طرح ناچنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کئی ملکوں کے بھوت تھے جو اپنی جیبیں سونے چاندی سے بھر کر مفلوج مشرق کے نیم جان سینے پر وحشیانہ رقص کر رہے تھے اور اس رقص کی بجتی‘ ابھرتی‘ قوسیں آہنی کڑیوں میں ڈھل کر ایک مسلسل زنجیر کی شکل میں زمین کے سینے کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑے ہوئے تھیں۔ اس شکنجے کی گرفت اور مضبوط ہو رہی ہے اور دھرتی کے سینے میں وہ لاوا اندر ہی اندر کھول رہا ہے جسے کسی خاص وقت اور

مناسب جگہ کی تلاش ہے اور جو ایک دن اچانک کسی مقام سے پھوٹ نکلے گا' زنجیریں موم بن پر پگھل جائیں گی اور سونے چاندی کے انبار' وقت کے سیلاب میں بہہ جائیں گے اور طوفان کی لہر' ہر ملک' ہر گھر میں سے ہو کر گزرے گی اور پھر بدتمیز خان کی جیبوں میں چاندی کے اتنے سکے نہ ہوں گے جنہیں پا کر وہ پاگلوں کی طرح ناچنے لگے گا۔

گاڑی لاہور کی طرف بھاگے جا رہی تھی۔

اور میں نے پھر اس لڑکی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا جس کا نام میرے خیال میں مریم تھا اور جو میری بیوی بن چکی تھی۔ میں نے سوچا اگر میرا کوئی ڈرائیور جہازی پیکارڈ لے کر نہ پہنچتا اور میرے پاس درجہ اول میں نشستیں بک کروانے کے لیے پیسے نہ ہوتے اور مریم تتلی کے پروں ایسی ساری کی بجائے پیراشوٹ کی قمیص اور شلوار پہنے ہوتی تو پھر کیا ہوتا؟

پھر یہی ہوتا کہ وہ تیسرے درجے کے زنانہ ڈبے میں صندوقوں اور اسباب کے ڈھیروں کے درمیان صلیب بنی کھڑی رہتی۔ میں بار بار کھڑکی میں آ کر اسے کہتا۔

"مریم بیٹھ جاؤ' یوں تو تھک جاؤ گی۔"

"مریم تمہیں پیاس تو نہیں لگی؟"

"مریم کپڑوں والی گٹھڑی کا خیال رکھنا۔"

اور ڈبے کی تمام عورتیں ہمیں مشکوک نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ ایک پوپلے منہ والی بڑھیا ساتھ والی موٹی عورت سے کہتی۔

"مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔"

بوڑھی عورتیں ہمیشہ دال میں کچھ کالا کالا سا ڈھونڈتی رہتی ہیں۔ وہ دال میں کالا کالا دیکھتی رہتیں اور گاڑی لاہور پہنچ جاتی۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر شہر کے اندر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور تنگ بازاروں میں نکل آتے۔ ایک چھوٹی سی گلی کے آگے جا کر تانگہ رک جاتا۔

گلی کی گندگی اور مرطوب فضا میں سے گزرتے ہوئے' ہمیں ایک آدھ جگہ کمزور بچے قمیصیں اٹھائے پکی ہوئی درمیانی نالی پر بیٹھے ملتے دو تین موڑ مڑنے کے بعد ہم ایک ڈربہ نما مکان کے دروازے کا ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہو جاتے۔ ہمیں دیکھتے ہی ڈیوڑھی میں بندھی بکری بے اختیار ممیانے لگتی اور مرغیاں کٹ کٹ کرتی ہوئیں ہمارے آگے دوڑنے لگتیں۔ صحن میں چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی مریم کی ماں ہمیں دیکھتی اور اٹھ کر مریم کو گلے لگاتی اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرتی جس سے میرے پیارے پیارے بالوں کا ستیاناس ہو جاتا۔ ہم ایک جگہ دیوار کے ساتھ بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ جاتے۔

مریم کے خشک ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیاں دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا کہ نیلوفر کی جڑوں میں پانی بالکل سوکھ گیا ہے اور پھول اپنے نازک ڈنٹھل پر بے رنگ ہو کر جھک گیا ہے۔ مریم مجھے دیکھ کر افسردگی سے مسکراتی۔ اس کے پژمردہ ہونٹ ذرا سے کھلتے۔ پتھریلے غار میں تھوڑی سی دراڑیں پیدا ہو جاتیں اور علی بابا کو اپنے چچازاد بھائی کی خون آلود لاش درمیان میں لٹکتی دکھائی دیتی اور مجھے محسوس ہوتا کہ مریم کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کا رنگ مزید گہرا ہو رہا ہے' بے تھیوون کا نغمہ بہار دلدوز مرثیے کے سوگوار سروں میں ڈھل رہا ہے اور والٹ ڈزنی کے شوخ رنگوں کی چمک ماند پڑ رہی ہے۔

مریم ہولے سے کہتی۔

”ذرا پانی دینا۔“

میں پانی لینے کے لیے اٹھتا اور مریم کی ماں ہاتھ سے گلاس پکڑ لیتی۔

”ذرا ٹھہرو بیٹا' میں ابھی سوڈا منگواتی ہوں۔“

”نہیں ماں میں سوڈا نہیں پیوں گی۔“

”بھلا کیوں نہیں پیوگی۔۔۔۔۔۔۔ ارے سعید؟“

وہ سعید کو آواز دیتی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک گندی نیکر' میلی قمیص اور سرکنڈوں ایسے خشک بالوں والا لڑکا نمودار ہوتا۔ وہ ہمیں دیکھنے یا سلام کرنے کی بجائے اپنی ماں کے پاس بیٹھ کر ایک کچا آلو منہ میں ڈال لیتا اور کچر کچر کھانے لگتا۔

ماں آلوؤں کا تھال پیچھے کھینچ لیتی۔

”کیوں ہیضہ مول لے رہا ہے۔ جا رحمو سے ایک میٹھی بوتل لے آ۔ اس سے کہنا کل تمہارا حساب صاف کر دیں گے۔“

اور سعید خوشی خوشی باہر نکل جاتا۔

سوڈے کی آدھی بوتل میں اور مریم پیتے اور آدھی سعید پی جاتا کیونکہ ہمارے سامنے بیٹھا ہمیں بوتل پیتے برابر دیکھے جاتا۔ مجھے اپنے بدن میں ایک تیز قسم کا زہر پھیلتے محسوس ہوتا اور میں بیڑی سلگا لیتا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔

دفعتاً ڈیوڑھی میں بکری زور سے ممیا اٹھتی اور ساتھ ہی دروازے کا ٹاٹ آگے کو اٹھ جاتا اور ایک پرانی سائیکل کا اگلا پہیہ اندر داخل ہوتا۔ پھر جب کرنجی آنکھوں' بھدی بھنوؤں اور چوڑے نتھنوں والا مریم کا ابا ڈیوڑھی میں سائیکل کھڑی کر دیتا تو مرغیاں بھاگ کر صحن میں آ جاتیں۔ وہ سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی پیپل کی شاخوں کو بکری کے آگے ڈالتا اور ہینڈل میں تیل بھرا تھیلا اتار کر ہماری

طرف بڑھتا۔

مریم اور میں اسے سلام کرتے اور وہ اپنے موٹے موٹے ہونٹ سکیڑ کر ہمارے سلام کا جواب دیتا۔ اس کی چپٹی ناک' الٹے استرے سے منڈی ہوئی کرخت کھال والے منہ پر پل بھر کے لیے پھیلتی اور پھر اپنی اصلی جگہ پر آ جاتی جیسے اسے ہمارے آنے کی خوشی بھی ہے اور افسوس بھی۔

تھیلا دیوار کی کیل سے لٹکا کر وہ کونے سے سوکھا ہوا حقہ اٹھا کر اسے نل کے نیچے رکھ کر تازہ کرتا۔ چلم میں تمباکو ڈال کر آگ جماتا اور چولہے کے پاس ہی بیٹھ کر اسے گڑگڑاتے ہوئے پوچھتا۔

''کون سی گاڑی سے آئے تھے؟''

وہ ہر آنے والے سے یہی پوچھتا ہے۔ اسے گاڑیوں کی آمدورفت کے متعلق بڑی تشویش رہتی ہے۔ فلاں گاڑی آج لیٹ ہو گئی تھی؟ فلاں گاڑی اگر یہاں سے چل کر راہ میں آدھ گھنٹہ لیٹ ہو جائے تو فلاں اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد آپ کو دوسری گاڑی مل سکتی ہے اور اگر دوسری گاڑی بھی لیٹ ہو جائے تو آپ اس گاڑی میں بیٹھے رہیں اور پانچویں اسٹیشن پر اتر کر فلاں ایکسپریس پکڑ لیں۔ وہ ہر گاڑی کی روانگی اور پہنچنے سے باخبر ہے۔ یہ اس کی غلطی ہے کہ وہ ریلوے ورکشاپ میں گاڑیوں کے پرزے ڈھالتا ہے۔ اسے ریلوے ہیڈکوارٹر کے دفتروں کا جنرل منیجر ہونا چاہیے تھا۔ مریم کی ماں کہتی۔

''آج پھر بھنگن نہیں آئی۔''

اور مریم کے ابا کی بھدی بھنویں کرنجی آنکھوں پر سکڑ جاتیں۔

''کیوں نہیں آئی وہ حرامزادی' شہدی' لفنگی؟ کیا ہوا جو پچھلے ماہ کے پیسے نہیں دیے۔ آج ملتا ہوں اس کے باپ سے۔ سالوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ ایک دن آئے تو دو دن ناغہ۔''

وہ غصے میں بڑبڑانے لگتا اور مریم کی ماں سعید کو باہر نکل جانے کا اشارہ کرتی کیونکہ وہ اس روز پھر کام پر نہیں گیا تھا۔ سعید کھسکنے لگتا مگر عین ڈیوڑھی کے پاس پہنچ کر اس کا باپ اسے آواز دیتا۔

''آج کام پر گئے تھے؟''

''ہاں ــــــــ گیا تھا۔''

اور اس کا باپ ایک دم چمک اٹھتا۔

”حرامزادے۔۔۔۔۔۔۔اپنے باپ سے بھی نوسربازیاں؟ مجھے تو تمہارا استاد خود بتا گیا تھا کہ صاحبزادہ آج کام پر نہیں آیا۔ لفنگے، کام نہیں کرے گا تو پھر کرے گا کیا؟ تیری کون سی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔ سالی نہ یہ اولاد ہوتی نہ یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے۔ تجھے تو تیری ماں نے بگاڑ دیا ہے۔ اگر کہیں میں تیری ماں ہوتا تو دیکھتا تو کس طرح کام نہیں کرتا۔“

مریم کی ماں بھی غصہ میں آجاتی۔

”تیری ہی اولاد ہے۔ میں کوئی اپنے میکے سے تو نہیں لائی۔ کام نہیں کرتا تو اس میں ماں کا کیا قصور؟ گھر سے نکال باہر کرو؟“

پھر ذرا رک کر دھیمی آواز میں ایک خطرناک جملہ کہتی۔

”آخر بیٹے کو باپ پر ہی جانا ہے نا!“

اور مریم کی بھنویں اکٹھی ہو جاتیں۔ چوڑے نتھنے ایک دم پھول جاتے۔

”میں کہتا ہوں تم بیچ میں ٹانگ کیوں اڑاتی ہو؟ میرا بیٹا ہے میں جو چاہے اسے کہتا پھروں۔“

مریم کی ماں چاقو اور آلو تھال میں پھینک کر پلہ آنکھوں میں دے کر رونا شروع کر دیتی۔

میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی کہ تم میرے پلے پڑے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ عمر بھر کا عذاب گلے پڑ جائے گا۔“

مریم کا باپ غصے میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا۔ حقے کا تلخ کش کھینچ کر وہ اپنی بیوی کو روتے دیکھ کر کہتا۔

”تمہاری قسمت پھوٹ گئی تو مجھے کون سا سرخاب کا پر لگ گیا ہے۔ اس گھر میں ہر وقت کا رونا ہی تو میری قسمت میں رہ گیا ہے۔

وہ قہر آلود نگاہوں سے سعید کو دیکھتا اور سعید بھیگی بلی بن کر باہر بھاگ اٹھنے کی گھات لگائے کھڑا رہتا۔ اس کے باپ کی پیلی پیلی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگتیں۔ بھنویں کبھی پھیلتیں اور کبھی سکڑ جاتیں۔ چوڑے نتھنے جیسے پھڑکنے لگتے۔ ہونٹوں پر غصہ کی ہلکی سی جھاگ نمودار ہو جاتی۔ اس کی حالت ایک دم ایسے گھوڑے ایسی ہو جاتی جو میلوں کا سفر کرنے کے بعد ابھی ابھی اپنے تھان پر آ کھڑا ہوا ہو۔ مرغیاں اینٹھ اینٹھ کر چولہے کے قریب اور حقے کے ارد گرد گھومنے لگتیں۔

ایک مرغی زور سے مریم کے باپ کے پاؤں پر ٹھونگا مارتی اور تھان پر بندھا ہوا گھوڑا ایکا ایکی بپھر کر چوکی اٹھاتا اور پوری قوت سے مرغیوں پر دے مارتا۔ مرغیاں چیختیں، چلاتیں ڈیوڑھی کی طرف بھاگ جاتیں اور سعید بھی لپک کر ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا۔ بکری اپنی پوری قوت سے ممیانے لگتی اور مریم کا باپ اٹھ کر نل کی طرف جاتا اور اپنا سر ٹونٹی کے نیچے کر کے پانی چھوڑ دیتا۔

مریم کی ماں آنسو پونچھ کر آلو چھیلنے لگ جاتی اور مریم غم، دکھ اور سوگ میں ڈوبی ہوئی نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھتی۔ جیسے وہ

اپنے سامنے یسوع مسیح کو صلیب پر کھنچتے دیکھ رہی ہو۔

میں محسوس کرتا جیسے مریم ایک مرمریں مجسمہ ہے۔ آسمانی پری کا مجسمہ، جسے کسی ماہر سنگ تراش نے میری قبر پر نصب کرنے کے لیے تراشا ہے۔ موت کا مجسمہ۔۔۔۔۔۔۔

شام کے وقت جب لیمپ کو دیا سلائی دکھائی جاتی اور مریم کی ماں چولہے پر توا ڈالتی تو اچانک خبر آتی مریم کا چچازاد بھائی ہیضے کا شکار ہو گیا ہے۔ یہ خبر صحن اور ہمارے چہروں پر ایک تاریک سایہ بن کر پھیل جاتی۔ توا چولہے پر ایسے ہی پڑا رہتا۔ مریم اور اس کی ماں برقع اوڑھتیں، سعید کا باپ اپنی ٹوپی جھاڑ کر پہنتا اور ہم لوگ خالہ کے گھر کی طرف چل پڑتے۔ بکری اور مرغیاں ہمیں غمناک خاموشی سے باہر نکلتے دیکھ کر سہم جاتیں۔ مریم کی ماں اور مریم کے باپ کی عارضی کشیدگی اس نئے غم کی آمد سے بالکل معدوم ہو جاتی۔ وہ یوں ایک دوسرے سے دھیمے دھیمے باتیں کرتے جاتے گویا کبھی جھگڑے ہی نہ ہوں۔ پرانے لیمپوں کی گدلی روشنی میں ہم گلی کی بودار دھندلی فضا خاموشی سے عبور کر جاتے۔ خالہ کے گھر کے قریب پہنچ کر ہمیں مشک کافور کی بو محسوس ہوتی اور عورتوں کے بین کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیتیں۔ خالہ کے گھر کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہی مریم اور اس کی ماں زور زور سے رونے لگتیں اور ایک کہرام مچ جاتا۔

گھر کے باہر کمیٹی کے لیمپ کی مدھم روشنی میں دری پر بیٹھے ہوئے چند رشتہ داروں اور چند ایک محلہ داروں کے چہروں پر موت ایسی مردنی چھائی ہوتی۔ خالو جان مجھے گلے سے لگا لیتے۔ ان کا جسم نحیف ہچکولوں سے لرزنے لگتا۔ مجھے اس جسم سے مشک کافور کی بو آتی اور میں سہم کر دری پر بیٹھ جاتا۔

"ہیضہ اب اس محلہ میں بھی زور پکڑ رہا ہے۔"

جلتے ہوئے اپلوں کے پاس بیٹھا ہوا مریل سا آدمی ایک موٹے آدمی کے کان میں سرگوشی کرتا اور اس موٹے آدمی کا رنگ مٹیالا پڑ جاتا۔ جیسے اسے بھی ہیضہ ہونے لگا ہو۔ وہ دوسری طرف منہ پھیر لیتا۔

مریم کا باپ خالو کے بڑے لڑکے کی طرف جھک کر پوچھتا۔

"کون سی گاڑی سے آئے تھے؟"

"کراچی ایکسپریس مل گئی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔۔ وہ لیٹ نہیں ہوگی۔"

اور جب اسے یقین ہو جاتا کہ کراچی ایکسپریس لیٹ نہیں تھی تو وہ دو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا کر کہتا۔

”اسے لکھ لیجئے۔“

خالو کا بڑا لڑکا اپنی نم آلود آنکھیں کاپی پر جھکا کر مریم کے باپ کا نام لکھ کر آگے دو روپے لکھ لیتا۔

تھوڑی دیر بعد کارپوریشن کے مریض نما ڈاکٹروں کی ایک ٹولی نمودار ہوتی۔ وہ گلی اور مکان کی نالی پر بدبودار دوائی چھڑک کر آگے نکل جاتے اور دری پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو عورتوں کے بین کی آوازوں میں موت کی سرد اور مہیب آوازیں سنائی دیتیں۔ انہیں محسوس ہوتا جیسے موت کا فرشتہ اپنے تاریک پر پھیلائے ان کے سروں پر چکر لگا رہا ہے۔

لوگ قریب سے گزرتے ہوئے دھیمی آواز میں سلام کہتے اور منہ پر کپڑا رکھ کر آگے نکل جاتے۔

مجھے وحشت سی ہونے لگتی۔ میں جوتا پہن کر وہاں سے کھسک جاتا۔ میں دیکھتا کہ لوگ دوکانوں کے باہر بیٹھے خوفزدہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو ہیضے سے بچنے کی تدبیریں بتا رہے ہیں اور ہر دکان اور مکان کے آگے گندگی کا ڈھیر لگ رہا ہے۔

گندگی ـــــــــ بیماری ـــــــــ موت!

بہار ـــــــــ بہار ـــــــــ بہار!

”مجھے تو اناناس بہت پسند ہے۔“ اور بتول کا گلابی قمیص میں ٹھسا ہوا بازو یوکلپٹس کی لوچدار شاخ کی مانند پھولدار پیالوں پر جھک گیا اور کیک پر اناناس کا سنہری مربہ چمکنے لگا۔ مریم نے کیک میری طرف بڑھا دیا اور مریم کے باپ نے دو روپے کا نوٹ اس کے خالہ زاد بھائی کی طرف بڑھا کر کہا۔

”اسے لکھ لیجئے۔“

عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں مہیب اور ڈراؤنی ہو گئیں اور مریم کا مجسمہ میری قبر کے سرہانے نصب کر دیا گیا۔ گلیوں میں سے گزرتے ہوئے میں نے تیز اور تلخ زہر کی لہریں اپنے جسم میں پھیلتی محسوس کیں۔

میں نے بیڑی کا ٹکڑا جیب سے نکالا اور اسے سلگایا۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔

عورتوں کے بین کرنے کی آوازیں ابھی تک کانوں میں گونج رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عورتیں میرے پیچھے پیچھے آ رہی ہیں اور میں اپنے بازوؤں میں مریم کے خالہ زاد بھائی کی لاش اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہا ہوں اور پیانو میں سے تھیون کا نغمۂ نو بہار چمنی کے گاڑھے دھوئیں کی مانند نکل رہا ہے۔ پیانو پر جھکی ہوئی بتول کا سپید جسم جالی دار قمیص میں سے پگھلی ہوئی موم بن کر بہنے لگا ہے۔ ایرانی قالینوں پر گندے قالینوں پر گندے پنجوں والی مرغیاں بدحواسی میں ادھر ادھر بھاگ رہی ہیں اور اطالوی صوفے

کے ساتھ بندھی ہوئی بکری بری طرح ممیا رہی ہے۔ وکٹورین آتش دان کے اوپر رکھی ہوئی میری تصویر دھوئیں میں تحلیل ہو رہی ہے اور مریم کے تتلی کے پروں ایسی ساری ماتمی چادر بن کر ہوا میں افسردگی سے جھول رہی ہے اور میری جہازی پیکارڈ کا ہارن زور زور سے چیخ رہا ہے۔ میں بیڑی کے کش پر کش لگا رہا ہوں۔ میرے ہونٹ جلنے لگے ہیں۔

میرے گلے سے کوئی کڑوی اور کسیلی شے چپک گئی ہے اور میں نے جلدی سے تھوک دیا اور تھوک بدتمیز خان پر جا گری تھی۔ اس نے بغیر کسی پوچھ گچھ کے بڑے آرام سے جوتا اتارا اور مجھ پر دے مارا۔ میرا ہاتھ بھی غیر شعوری طور پر اپنی قبل از مسیح کے زمانے کی پشاوری چپل کی طرف بڑھا۔ شیخ غلام کف گیر بھی اپنے ڈنلوپ ٹائر کے تلوں والے بوٹوں کے تسمے کھولنے لگا۔ قہر الٰہی مجسم قہر بن ہمیں گھور رہا تھا۔

کیونکہ ہم نے اپنی بے جا خرمستیوں سے ان کا جما ہوا کھیل خراب کر دیا تھا۔ گاڑی کی رفتار مدھم ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ میں نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر پچھلے زنانہ ڈبہ کی طرف دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی جس کا نام مریم تھا' اس ڈبے کے کونے میں ابھی تک صلیب بنے کھڑی تھی۔

مگر اب وہ سچ مچ تھک گئی تھی۔ اس کے اوپر کو اٹھے ہوئے بازوؤں میں خون کی رفتار سست پڑ گئی تھی اور پنڈلیوں میں سوئیاں چبھنے لگی تھیں۔ اس کا جسم کمان کی مانند ایک جانب کو جھک گیا تھا اور جب عورت کا جسم تھک کر ایک طرف جھک سا جاتا ہے تو آسمان پر تاروں کی گردش تھم جاتی ہے۔ چاندنی میں نہائے ہوئے خاموش جنگلوں کی نیلگوں فضا میں ان سنے گیتوں کی موسیقی بیدار ہو جاتی ہے اور نیلے نیلے پتھروں کے درمیان بہنے والی جنگلی پھلوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑی ندیوں کی رفتار تیز ہو جاتی ہے اور انجیر کے درختوں میں چھپے ہوئے شہد کے چھتوں میں سے سنہری شہد ٹپکنے لگتا ہے۔ زمین کے بنجر سینے میں حسن اور آرٹ کے غیر فانی چشموں کی نیند ٹوٹ جاتی ہے اور چنار کے درختوں پر بہار کے آتشیں پھولوں کے سرخ سرخ بازو جھلملا اٹھتے ہیں۔

مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے انار کی پھلی پھولی شاخ زمین کی طرف جھک آئی ہے اور پکے ہوئے اناروں کی چکنی کھال پر سے میٹھا رس بہہ رہا ہے۔ انار پک چکے تھے اور اب یہ ٹوٹ کر گرنے ہی والے ہیں۔

گاڑی سیاہ پٹڑیوں پر اپنے تئیں سنبھلتی ہوئی رک رہی تھی۔ اسے ہر قدم پر جیسے ٹھوکر سی لگتی تھی۔ اور جھکی ہوئی شاخ پر سے پکے ہوئے انار کانپ رہے تھے۔ انہیں جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ ٹوٹ کر گرنے والے تھے۔ وہ گر کر ٹوٹنے ہی والے تھے اور جب وہ گر پڑیں گے اور ٹوٹ جائیں گے تو چمکیلی دھوپ میں نیلگوں آسمان تلے' سنہرے کھیتوں کے پاس بیٹھے ہوئے کم سن چرواہوں کی

بانسریوں میں سے گیتوں کے پھول جھڑنے لگیں گے۔ دوشیزۂ بہار اپنے سندر مکھڑے پر سے تاروں جڑا آنچل اٹھا دے گی اور کائنات کا ذرہ ذرہ سیمگوں اجالے میں ڈوب کر جگمگا اٹھے گا۔

گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔ انار کی شاخ کو جھٹکا لگا اور انار ٹوٹ کر زمین پر آن گرے اور رس بھرے چمکیلے موتی بے ترتیبی سے بکھر گئے اور اس سے پیشتر کہ کم سن چرواہوں کی بانسریوں سے پھول جھڑیں اور معصوم نغمے جھوم کر مدہوش فضاؤں میں پھیل جائیں اچانک دو ٹکٹ چیکر سیاہ وردی میں ملبوس ہمارے ڈبے کی طرف بڑھے۔

"قریشی گروپ"

شیخ غلام علی کف گیر کی عینک نیچے لٹک گئی۔ بدتمیز خان کا سگریٹ ہونٹوں تک پہنچتے پہنچتے رک گیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور کھڑکی سے دوسری طرف کود گیا۔ تاش اور آنے دونیاں فرش پر لڑھک گئیں۔ قہر الٰہی بھی اس کے ساتھ ہی کود گیا۔ آئس کریم بخش کو بیمار بخت کی خبر نہ تھی اور بیمار بخت‘ خموش علی سے بے خبر انجن والے ڈبوں کی طرف بگٹٹ بھاگے جا رہا تھا۔

میں بھی باہر کود چکا تھا اور گارڈ والے ڈبوں کی طرف نکل گیا تھا اور جب گاڑی اس اسٹیشن سے ٹھمک ٹھمک کر چلتی‘ پلیٹ فارم عبور کر گئی اور دور کہیں کھو گئی تو میں نے اپنے آپ کو وہاں بالکل تنہا پایا۔

میں اس وقت بھی اس چھوٹے سے اسٹیشن پر تنہا ہوں۔

میں نے پھر اس لڑکی کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ہے جسے میں نے گوجرانوالہ اسٹیشن پر دیکھا تھا اور جس کے متعلق یہاں تک سوچتا آیا ہوں اور اگر یہاں نہ رہ جاتا تو لاہور تک سوچتا جاتا۔

مگر میں آج لاہور نہیں جاؤں گا۔

◆◆◆

اور آواز آئی

''...........کہ اے میرے محبوب! مت ڈر اور بے خوف ہو کر اسے پکڑ لے کہ یہ اژدھا نہیں ہے اور جب حضرت موسیٰ نے اژدھا پر ہاتھ رکھا تو وہ عصا بن گیا۔۔۔۔۔۔۔شیخ جی کیا سنتے ہو؟ اژدھا عصا بن گیا......''

شیخ جی کا سبز چغہ' سرخ داڑھی اور ہری پگڑی والا مرشد اتنا کہہ کر بڑے فخر سے اپنے مرید کی طرف دیکھنے لگا۔

جیسے اس نے ابھی ابھی کسی اژدھے پر ہاتھ رکھ کر اسے عصا بنا دیا ہو۔ شیخ جی اپنے مرشد کے پاؤں دباتے ہوئے جھوم گئے۔

''اللہ ہی اللہ۔۔۔۔۔۔۔اللہ ہی اللہ''

ان کی جنگلی کبوتر ایسی دھندلی اور سرخ آنکھیں معرفت کے سرور سے بند ہونے لگیں اور کھلی صدری کے درمیان سینے پر مرشد کے ہاتھ کا لکھا ہوا تعویذ وجد کرنے لگا۔ اپنی دوکان کے تختے پر بیٹھے بیٹھے وہ اور عقیدت سے اپنے مرشد کے پاؤں دبانے لگے۔

شیخ جی کی دوکان کے ساتھ' مسجد کی دیوار کے تلے' تخت پوش پر کچھ لوگ تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے زور سے ترپ کا پتہ نیچے پھینکا اور وہاں ایک ہلڑ مچ گیا۔

شیخ جی نے اپنی دھندلی اور سرخ آنکھیں اٹھا کر پہلے اس منڈلی کو دیکھا اور پھر اپنے مرشد کی طرف نظریں پھیر کر جھکا لیں۔ ان کے مرشد نے رنگ برنگے منکوں والی تسبیحوں سے لدی ہوئی گردن گھما کر تاش کھیلنے والی منڈلی پر ایک غضبناک نگاہ ڈالی اور شیخ جی کی طرف جھک کر فرمایا۔

''قیامت آ رہی ہے۔''

شیخ جی کے کمزور بدن میں سر سے پاؤں تک کپکپی طاری ہو گئی۔ انہیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے کل یا پرسوں قیامت آ جائے گی اور ان کی دوکان کی چھت دھڑام سے ان پر آن گرے گی اور وہ اپنے گلے سڑے پھلوں والے ٹوکروں سمیت کچلے جائیں گے اور ان کی تمام ہڈیاں پس جائیں گی۔ وہ سہم کر مرشد کے پاؤں جھک گئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کل سے دوکان کے اندر بیٹھنے کی بجائے کے باہر بیٹھ کر پھل بیچا کریں گے۔

دوکان کے باہر بیٹھ کر پھل بیچنے میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ وہ جھنڈاں سے معرفت لڑا سکتے تھے۔ جھنڈا کا مکان شیخ جی کے عین

سامنے والی گلی کی پیشانی پر تھا۔ جھنڈاں کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی لیکن اس کے ہاں اولاد نہ تھی۔ اس کا سیاہ بدن اس قدر بھدا اور تھل تھل پل پل تھا کہ اس کا عضو عضو ”پیٹ سے“ معلوم ہوتا تھا۔ جب وہ اپنے موٹے ہونٹوں پر پان کی لالی جمائے سینے کے مشکیزے ڈھلکائے مکان کی ڈیوڑھی میں پیڑی ڈال کر بیٹھ جاتی اور اپنی ہمسائی موچن سے نئی چھاپہ دار کلیوں پر باتیں شروع کر دیتی تو شیخ جی کو ایک ہی پل کے اندر خدا کی یاد آ جاتی۔ انہیں محسوس ہوتا کہ خود خدا کی ذات جھنڈاں کے روپ میں ان کے سامنے بیٹھی ہے اور چھاپہ دار کلیوں پر گفتگو کر رہی ہے۔

وہ دوکان سے باہر نکل کر تختے پر آ کر بیٹھ جاتے اور باسی گنڈیریاں، گلی سڑی لوکاٹیں اور گندے امرود چھوٹے بچوں میں بانٹنے لگتے۔ ”کہو اللہ جی! اللہ جی۔۔۔۔۔۔ جو اللہ نہیں کہے گا، اسے کچھ نہیں ملے گا۔“

پھر شیخ جی کی دکان کے آگے بچے ”اللہ جی اللہ جی“ کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیتے اور شیخ جی ان میں پھل بانٹتے بانٹتے دھندلی دھندلی سرخ آنکھیں اٹھا کر جھنڈاں سے بھی معرفت لڑانے لگتے اور جھنڈاں اپنی کچری ایسی آنکھیں مٹکا مٹکا کر اپنی ہمسائی موچن سے کہتی۔

”تم مانو نہ مانو مجھے تو شیخ جی پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“

اور جھنڈاں کا خیال سو فیصدی درست تھا۔ شیخ جی بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ وہ روز روشن میں جھنڈاں کے مکان کی پچھلی کوٹھڑی تک پہنچے ہوئے تھے۔ جہاں وہ اپنے خاوند سے چھپ کر شیخ جی کے بھیجے ہوئے کیلے کھایا کرتی تھی اور اگر اس کوٹھڑی سے پیچھے بھی کوئی کوٹھڑی ہوتی تو شیخ جی اپنی معرفت کے زور سے ہاں بھی پہنچ گئے ہوتے۔

یہ معرفت مثل ایک گیس پلانٹ کے تھی جس کے استعمال سے شیخ جی مہینوں کا سفر دنوں میں طے کر لیتے تھے۔

شیخ جی کی دوکان سے جھنڈاں کی پچھلی کوٹھڑی۔۔۔۔۔۔ مہینوں کا سفر تھا۔ لیکن شیخ جی نے اپنے گیس پلانٹ کے زور سے اسے دنوں میں ہی طے کر لیا تھا۔ جھنڈاں خود ایک گیس پلانٹ لگوانے کی فکر میں تھی۔ اسے شیخ جی سے اولاد حاصل کرنے کی خواہش نہ تھی، جتنی بلھے شاہ کی کافیاں بمعہ ترجمہ پڑھنے کی۔ اولاد کے لیے تو وہ ایک بار سوال کر چکی تھی اور اسے جواب بھی مل چکا تھا۔

اس نے سوال کیا تھا۔

”شیخ جی لڑکا ہونا چاہیے۔“

اور شیخ جی نے اس کا شانہ ٹٹولتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ”لڑکا ہی ہوگا، تم بڑی کرموں والی ہو۔ تم کرموں کی ڈیوڑھی ہو۔“

مگر کافی بلھے شاہ بمعہ ترجمہ پڑھنے کی خواہش جھنڈاں کے دل ہی دل میں چکر لگا رہی تھی۔

شیخ جی کے مرشد نے اپنی دوسری ٹانگ آگے سرکا دی۔

وہ ذرا کھانسے' سرخ داڑھی میں انگلیاں پھیریں اور بولے۔

''جب حضرت یونس علیہ السلام پہلی بار مچھلی کے پیٹ میں گئے تو مچھلی کو خدا کی طرف سے آواز آئی کہ اے سمندر کے جانور میرے محبوب کو یہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے۔''

اور جب شیخ جی نے ہمارے محلے میں پہلی بار آ کر ریوڑیاں اور مرمرے بیچنا شروع کیا تو محلے کے چوہدری نے گلی میں کھڑے ہو کر سب لوگوں کو ہدایت کر دی کہ وہ سودا ان سے ہی خریدیں' کیونکہ وہ نومسلم ہیں۔ چنانچہ عملی ثبوت دیتے ہوئے چوہدری نے اسی وقت شیخ جی سے دو پیسے کا مرمرا اور دو پیسے کی ریوڑیاں لے کر وہیں منہ مارنا شروع کر دیا اور ایک آنے کے ادھار سے اپنا حساب شیخ جی کی نوٹ بک پر کھلوالیا۔ پھر شیخ جی کی نوٹ بک پر کئی حساب کھل گئے اور شیخ جی نے جلد ہی محسوس کیا کہ انہیں ایک رجسٹر لا کر رکھنا چاہیے۔ نیا رجسٹر آ گیا اور اس کے ساتھ ہی دوکان پر تازہ اور رنگ دار پھلوں کی ٹوکریاں بھی ایک دوسری کے اوپر سیڑھیوں کی مانند سجنے لگیں۔

شیخ جی سوتے بھی دوکان میں ہی تھے۔ رات گئے تک وہ دروازہ بند کئے دیے کی ٹمٹماتی لو میں بلھے شاہ کی کافیاں گاتے رہتے۔ ان کی آواز میں بلا کا اکھڑپن اور کرختگی تھی۔ یوں محسوس ہوتا کہ وہ بلھے شاہ کی کافیاں نہیں پڑھ رہے بلکہ بالٹیوں کو ٹین کے پیندے لگا رہے ہیں۔

انہوں نے محلے کے ایک آوارہ کتے کو پالنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسے روزانہ دو وقت دودھ میں روٹی بھگو کر ڈالتے۔ کتا دم ہلا ہلا کر دودھ بھری روٹی کھاتا اور شیخ جی کا چہرہ فتح مندی کی مسکراہٹ سے چمکنے لگتا اور وہ ہر گذرنے والے کی طرف دیکھ کر کہہ اٹھتے۔

''کر سیوا تے کھا میوہ''

مگر شیخ جی کو سیوا سے کام تھا۔ میوے سے کوئی غرض نہ تھی۔ ان کی دکان پر میووں کے انبار لگے رہتے لیکن شیخ جی نے کبھی کوئی بیر لوکاٹ یا جامن اپنے منہ میں نہیں ڈالا تھا۔

گرمیاں آئیں اور شیخ جی نے دوکان کے باہر مٹی کے دو مٹکے ٹھنڈے پانی سے بھر کر رکھ دیئے۔ محلے والوں کو رہ رہ کر پیاس لگنے لگی۔ شیخ جی کا معمول ہو گیا کہ میوہ منڈی سے لوٹتے ہوئے ایک دو اخبار بھی خرید لاتے۔ چنانچہ صبح ہی صبح ان کی دوکان پر لائبریری سی

کھل جاتی۔ پہلے تو خاموشی سے اخباریں پڑھی جا رہی ہیں اور پھر حسب توفیق بلند آواز میں بحثیں ہو رہی ہیں اور شیخ جی نیم کے ہرے ہرے پتوں پر زرروز رولوکاٹوں کے گچھے لگا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ پھر دن بھر ان کی لائبریری کے اخبارات محلے کے گھروں میں گھومتے رہتے اور شام کے وقت جب وہ خستہ حالت میں واپس پہنچتے تو شیخ جی کو لوگوں کی بدذوقی پر بے حد غصہ آتا۔

“اخبار لے جاتے ہیں مگر پڑھنا تو سیکھ لیں پہلے۔” وہ اخباروں کو تہہ در تہہ جماتے ہوئے بول اٹھتے۔ پھر دن میں کئی کئی بار پھٹے ہوئے اخبار اپنے گاہکوں کو کھول کھول کر دکھاتے۔

“اخبار لے جاتے ہیں مگر۔۔۔۔۔۔”

جھنڈاں کے دل میں کافی بلھے شاہ معہ ترجمہ پڑھنے کی حسرت اپنے چکر پورے کر چکی تھی۔ رات کے وقت وہ بلاناغہ شیخ جی کی آواز سنتی کہ بلھے شاہ کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ بالٹیوں کو پیندے لگ رہے ہیں اور اس کا دل چاہتا کہ وہ بھی کتاب لے کر ادب سے شیخ جی کے پاس بیٹھ جائے، اور معرفت کی روشنی سے اپنے قلب کو منور کر لے۔

چنانچہ اس نے ایک روز ایک چھوٹی بچی کے ہاتھ شیخ جی کو بلوا بھیجا اور شیخ جی دوسرے ہی روز جبکہ گلی میں شام ہو رہی تھی جھنڈاں کے گھر میں جا داخل ہوئے۔ اس وقت جھنڈاں پمپ کے نیچے بیٹھی نہا رہی تھی۔ شیخ جی رک گئے۔

“تو میں جاتا ہوں، پھر سہی۔”

“کیوں جی؟ آپ اندر بیٹھئے، میں ابھی آ جاتی ہوں۔”

اور شیخ جی پمپ کی طرف منہ کئے اندر چلے گئے۔ اندر پہنچ کر انہوں نے کیلوں کا گچھا ایک ٹرنک پر رکھ دیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جھنڈاں بھی نیم برہنہ جسم لیے اندر آ گئی اور شیخ جی کے پاس بیٹھ کر بلھے شاہ کی کتاب نکال کر نور معرفت سے اپنا دل بھرنے لگی۔

شیخ جی اب اکثر وہاں جانے لگے اور بہت جلد جھنڈاں کو محسوس ہونے لگا کہ اس کا دل نور سے بھر گیا ہے اور اب اس میں نور کی گنجائش نہیں رہی۔ ایک روز اس نے شیخ جی سے کہا۔

“آپ تو پہنچے ہوئے ہیں۔ میں تو آپ کی خاک بھی نہیں ہوں۔”

اور شیخ جی نے اس کی بھینس ایسی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

“ہم تمہیں بھی اپنے مقام پر پہنچا دیں گے۔”

اور پھر جھنڈاں بھی وہاں پہنچ گئی جہاں شیخ جی پہنچے ہوئے تھے اور جہاں جھنڈاں پہنچی ہوئی تھی۔ وہاں شیخ جی ایک روز پہنچ رہے تھے کہ محلے کے امام مسجد نے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا محلے کے سارے آدمی وہاں پہنچ گئے۔ شیخ جی بدنامی کے خوف سے دکان بند کر کے اپنے مرشد کے گاؤں چلے گئے اور ڈیڑھ ماہ تک اپنے مرشد سے خدا تک پہنچنے کے راستے کا نقشہ ذہن نشین کرتے رہے جب وہ واپس آئے تو دوکان کے باہر بیٹھنے کی بجائے دوکان کے اندر بیٹھ کر پھل بیچنے لگے اور احتیاطاً امام مسجد کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا۔

’’اجی کبھی فقیروں اور مولویوں کی بھی بنی ہے؟‘‘

’’انہیں کیا پتہ فقیری کیا ہے اور خدا سے تار کس طرح ملتی ہے؟‘‘

اور یہ صحیح تھا کہ شیخ جی نے جھنڈاں سے منہ موڑ کر اب خدا سے تار ملالی تھی۔ وہ مسجد میں جا کر پانچ وقت سجدہ ادا کرتے۔ دن میں تین بار بھنگ پیتے پھر جب نماز پڑھتے پڑھتے انہیں اونگھ آ جاتی اور نمازی دوبارہ وضو کرنے کو کہتے تو چمک اٹھتے۔

’’آپ کیا جانیں' یہ اونگھ تھی یا خدا سے تار مل رہی تھی۔‘‘

اور نمازی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔

ایک بار میں شیخ جی کے ساتھ کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ امام نے ذرا لمبی آیت شروع کر رکھی تھی۔ کھڑے کھڑے وہ اچانک نیم کے پتلے سے درخت کی مانند جھولنے لگے اور ایک بار جو ذرا تیز جھونکا آیا تو منہ کے بل صف پر جا گرے۔ گرتے ہی اٹھے اور پھر نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ نماز ختم ہوئی تو نمازیوں نے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

’’شیخ جی نیند آ گئی تھی کیا؟‘‘

’’شیخ جی منہ سر تو بچ گیا؟‘‘

اور شیخ جی منہ پھلائے جوتا اٹھا باہر نکل گئے۔

دوسرے دن جب میں نے انہیں اطمینان سے پوچھا کہ کیا بات تھی تو انہوں نے بڑے اطمینان سے بتایا کہ ان کی تار خدا سے مل رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خدا بجلی کا کھمبا ہے اور شیخ جی پلاس اور تاریں لے کر اس کے سرے پر پہنچے ہوئے ہیں۔

شیخ جی کھمبے پر چڑھے تاریں ملا رہے تھے اور امام مسجد نیچے سے سیڑھی کھینچ رہا تھا۔ اس نے مسجد میں بیٹھ کر نمازیوں کے سامنے شیخ جی اور جھنڈاں کے قصے کو ہوا دینی شروع کر دی تھی۔ وہ کھلم کھلا شیخ جی کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ دو ماہ سے شیخ جی سے ادھار پھل کھا رہا تھا لیکن پس پردہ اس نے لوگوں پر ظاہر کرنا شروع کر دیا تھا کہ شیخ جی یونہی مسلمان نہیں ہوئے۔ دراصل وہ اپنے گاؤں میں دو

خون کر آئے ہیں۔ ایک اپنی بیوی کا اور دوسرا بیوی کے یار کا۔ گلی والوں نے شیخ جی کو گھورنا شروع کر دیا۔ ہوتے ہوتے یہ بات شیخ جی تک بھی جا پہنچی۔ چنانچہ وہ بھی بھنگ پی کر آنکھیں جنگلی کبوتروں کی مانند سرخ انگارہ کئے امام مسجد کے خلاف کہانیاں بیان کرنے لگے۔

"اجی ہم سے اس مولوی کی کون سی بات چھپی ہے؟"

"وہ منڈھے جھیور کی لڑکی ہے ناں-------وہی بیوہ-------

بس جی وہ ایک دن مسجد میں آ گئی اور مولوی صاحب اکیلے ہی بیٹھے تھے۔ پھر کیا تھا-------"

اور پھر لوگوں نے امام مسجد کو گھورنا شروع کر دیا۔

تین چار مہینے امام مسجد اور شیخ جی میں خوب کھینچا تانی ہوئی۔ لوگ کبھی شیخ جی کو گھورتے اور کبھی امام مسجد کو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ جی نے مسجد میں نماز پڑھنا چھوڑ دی اور مولوی صاحب نے شیخ جی سے ادھار پھل کھانا چھوڑ دیا۔

لیکن شیخ کی تار اب خدا سے مل رہی تھی۔ اب ان کا ہری پگڑی اور لال داڑھی والا مرشد بہ نفس نفیس ان کی دکان پر تشریف لاتا تھا۔ علاوہ ازیں انہوں نے اپنے مرشد کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے گندم کھانا بھی ترک کر دیا تھا۔ گندم نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہشت سے نکلوا دیا تھا اور شیخ جی اس گلی سے باہر نکلنا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

اب ان کا گزارہ دودھ چاول اور میووں پر تھا۔ اب انہوں نے سیوا کا میوہ بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔

شیخ جی کے مرشد کی دوکان صدر بازار میں تھی۔ ان کی دوکان کا داتن سرمہ اور مہندی شہر بھر میں مشہور تھی۔ ان کی دوکان پر سارا دن عورتوں کا جمگھٹا رہتا۔ لیکن وہ خود دوکان پر بہت کم بیٹھتے تھے۔ جب کدا سے لو لگی ہو تو دنیاوی کام کاج ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ چنانچہ دوکان پر اکثر ان کا نوعمر لڑکا بیٹھتا جسے جسم بنانے کا بڑا شوق تھا اور جو ہر روز اکھاڑے میں جا کر کشتی لڑتا تھا۔ کشتی لڑنے کے علاوہ اسے آنکھیں لڑانے کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ کئی ایک طرح دار عورتوں کی دوکان پر مفت باندھ لگی ہوئی تھی۔

شام کے وقت دوکان بند کر کے وہ گلے سے کچھ نقدی جیب میں ڈال کر اپنے یاروں کے ساتھ رنڈیوں کے بازار میں نکل جاتا اور وہاں کافی رات گئے تک موتیے کے ہار گلے میں ڈالے بیٹھک بیٹھک گھومتا رہتا۔ کئی مریدوں نے دبی دبی زبان میں اپنے مرشد سے شکایات بھی کیں، لیکن وہ ہر بار معاملے کو دبا جاتے۔ انہیں وہ دن نہیں بھولا تھا جب روپے نکالنے کے لیے ان کا بیٹا ان کی چھاتی پر چڑھ آیا تھا اور انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے چابیوں کا گچھا اسے تھما دیا تھا۔

شیخ جی ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے کچھ رقم اپنے مرشد کے پاس جمع کروا دیتے جسے ان کا بیٹا بڑی باقاعدگی سے رنڈیوں کے بازار میں اڑا رہا تھا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ شیخ جی خدا سے تار ملا رہے تھے اور ان کے مرشد کے لڑکے کی تار شہر کی دو تین گانے والیوں سے مل چکی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ

''عورت خدا کی مورت ہے' صوفی لوگوں نے ہمیشہ عورت میں خدا دیکھا ہے۔''

اور ان کا بیٹا ایک چھوڑ تین چار خداؤں سے تار ملا چکا تھا۔ معرفت میں وہ اپنے باپ سے بھی چار قدم آگے تھا۔

شیخ جی کے مرشد نے شہادت کی انگلی ہوا میں اٹھا کر کہا۔

''شیخ جی -------ایک خدا' ایک رسول' ایک کتاب اور ایک ہی اسم اور ایک ہی صرف -------بس ایک ہی کا کھیل ہے-------'' وہ خاموش ہو گئے اور شیخ جی نے ایک جھرجھری سی لی' اور ان کا سر خود بخود ہلنے لگا۔ ماشٹر سٹے باز نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک کا حرف سن لیا تھا۔ اس نے تاش کھیلنے والوں کی منڈلی میں جا کر رحموں قلعی گر کے کان میں کہا۔

''ماشٹر! آج اگر ایک کا حرف نہ پڑے تو مونچھیں کٹوا ڈالوں گا۔'' اور رحمو قلعی گر تاش کے پتے اپنے ساتھی کو تھما' جوتی جھاڑ کر اٹھا اور حاجی حرامی کی دوکان میں گھس گیا۔ حاجی حرامی کونے والی بنچ پر بیٹھا سٹے کی پرچیاں لکھ رہا تھا۔ رحمو نے جاتے ہی پانچ آنے کا ایک حرف لگا دیا اور واپس آ کر پھر تاش کھیلنے لگا۔

شیخ جی کے مرشد کی انگلی اب نیچے گر چکی تھی اور وہ انہیں ایک کے حرف کی اہمیت جتلا رہے تھے اور حاجی حرامی ایک کے حرف کی پرچی لکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر وہ بھی اس حرف پر کچھ لگا دے تو کیا حرج ہے۔

مسجد کی دیوار تلے چارپائی پر لیٹے لیٹے چوئی جوارئیے نے اپنا مختصر سا کمزور جسم پھیلا کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور سرخ صافے سے منہ پونچھتا ہوا اٹھ کر گانے لگا۔

''میرے پریتم پیاریا-------تیرا خیال آیا ہوا''

ماشٹر سٹے باز نے حقے کی نے گھماتے ہوئے چوئی کی طرف دیکھا۔

''اٹھ بیٹھے ہو ماں کے جنٹلمین-------کر بلما ٹرپے لائنوں لین''

مگر چوئی نے جیسے کچھ نہیں سنا تھا' وہ اپنے گندے دانتوں اور کھردری کھال والا بدصورت منہ کھولے ایک ہاتھ کان پر رکھے بدستور گا رہا تھا۔ جیسے اس کا مختصر سا مکروہ وجود سننے' بولنے' چکھنے اور سمجھنے کی حدود سے باہر نکل کر ایک غیر فانی اور لازوال نغمے کی شکل

میں آفاق کی بیکراں وسعتوں میں اڑا جا رہا ہو۔

اوپر ہی اوپر۔۔۔۔۔۔۔اوپر ہی اوپر

او گھٹا' کالی گھٹا!

اور چوئی کی آواز تیز بن' کسے ہوئے کمان سے سن کی آواز کے ساتھ اڑی جا رہی تھی۔ سب سے الگ' سب سے جدا' سب سے تنہا ۔۔۔۔۔۔اس کا ایک اس منڈلی میں کوئی نہ تھا۔ اس گلی میں کوئی نہ تھا۔ دن رات جوا کھیلتا تھا۔ جوئے میں جیت پا کر وہ کئی کئی دن محلے سے غائب رہتا اور جب ہار جاتا تو آدھا بوریا نیچے اور آدھا اوپر لے کر مسجد کی دیوار تلے چار پائی پر پڑا رہتا۔ اور جب آنکھ کھلتی تو گانے لگتا۔

”میرے پریتم پیاریا۔۔۔۔۔۔“

وہ اب بھی گا رہا ہے۔ وہ کل سے اپنا سب کچھ ہار چکا ہے۔ اس کی آواز شکست کی آواز ہے۔ یہ وہ آواز ہے جو خزاں میں خشک پتوں پر چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ سوکھی' پژمردہ' تیز۔۔۔۔۔۔۔اس میں جلتی ہوئی لکڑیوں کی چٹک اور کھولتے ہوئے لاوے کی سکار ہے۔ یہ آواز چوئی کے ہارے ہوئے دل سے زخم خوردہ ناگن بن کر اٹھ رہی ہے اور اس کی روح کو ڈسے جا رہی ہے اور وہ منہ کھولے آنکھیں بند کئے ایک ہاتھ کان پر رکھے اس زہر کو امرت سمجھ کر پی رہا ہے۔ ایک دفعہ اس نے دو سو روپے جیتے اور خلاف توقع شیخ جی کے پاس لا کر رکھ دیئے مگر دوسرے ہی دن واپس بھی لے لیے۔ شیخ جی نے فرمایا۔

”چوئی کیوں دولت برباد کر رہا ہے۔ کچھ برے دنوں کے لیے بھی بچا کر رکھ لے۔“

اور چوئی نے کہا تھا۔

”شیخ جی! ہمارے لیے کوئی دن برا یا اچھا نہیں۔ سب ایک سے ہیں اور پھر یہ رقم تو ہمارے پاس امانت ہوتی ہے۔ ابھی میرے پاس ابھی کسی دوسری کی جیب میں۔ عورت کی مانند جوارئیے کی دولت کا کیا اعتبار؟“

اور شیخ جی نے محسوس کیا تھا کہ چوئی کبھی نہیں سنبھل سکتا۔

لیکن ایک روز چوئی مسجد کے حوض پر بیٹھا غلط ملط وضو کر رہا تھا اور بوڑھے کھوسٹ نمازی اسے شرارت سے تک رہے تھے۔

چوئی نے وضو کے بعد باجماعت نماز ادا کی اور جب وہ نماز پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو اسے نمازیوں نے گھیر لیا۔

چوئی نے وضو غلط کیا تھا' اس کی نماز جائز نہیں۔

”چوئی کی دھوتی گھٹنوں سے اوپر تھی۔“

کسی نے کہا۔

”شکر ہے خدا کا چوئی کو ہدایت مل گئی۔“

اب چوئی نے برے کاموں سے توبہ کر لی ہے۔“

اور چوئی سوچنے لگا۔ ”کیا وہ بدکار ہے؟“ جہاں تک اس کا خیال تھا اس نے کبھی محلے کی بہو بیٹیوں کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا تھا اور خدا سے تو وہ ہمیشہ ڈرتا رہتا تھا۔ پھر۔۔۔۔۔۔ اس نے کبھی کسی کا دل بھی نہیں دکھایا تھا۔ یہ بوڑھے کھوسٹ اسے کیا الزام دے رہے تھے۔ کیا یہ نماز کا کرشمہ تھا؟ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ پھر کبھی مسجد میں قدم نہیں رکھے گا اور چوئی نے پھر کبھی مسجد میں قدم نہیں رکھا۔

اور شیخ جی کو یقین ہو گیا تھا کہ چوئی کے لیے جنت کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔

شیخ جی نے پاؤں دباتے دباتے اچانک اپنے مرشد کی طرف جھک کر ہولے سے پوچھا۔

”یہ ڈاکٹر شکوہ اقبال جو لاہور میں رہتے تھے' ان کا رتبہ کیا تھا؟“

اور شیخ جی مسکرائے۔ ایک راز بھری مسکراہٹ۔۔۔۔۔۔

انہوں نے اپنی سرخ داڑھی میں انگلیاں پھیر کر ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی ان کی خفیہ گفتگو سن تو نہیں رہا۔ جب انہیں اردگرد کوئی فالتو آدمی دکھائی نہ دیا تو انہوں نے اپنے مرید کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔

”ڈاکٹر شکوہ اقبال کا رتبہ قطب کا رتبہ تھا۔۔۔۔۔۔ کسی سے ذکر نہ کرنا۔۔۔۔۔۔ یہ تو انہوں نے پردہ رکھنے کے لیے شاعری کی ہے۔ لو تمہیں ایک واقعہ سناتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ لاہور گیا۔ رات داتا صاحب کے آستانے پر گذاری۔ وہاں آواز آئی کہ بھئی شکوہ اقبال صاحب انتظار کر رہے ہیں ان سے مل لو چنانچہ صبح اٹھتے ہی اقبال صاحب کے گھر کی راہ لی۔ گھر پہنچا تو آپ اس وقت ستو پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فوراً پہچان گئے کہ اس فقیرانہ لباس میں ان سے کون ملنے آیا ہے۔ دوسرے لوگوں کو اسی وقت اٹھوا دیا اور بڑھ کر گلے سے لگ گئے۔ بس گلے لگنے کی دیر تھی کہ آپ کی تار مل گئی اور آپ فرش پر ماہی بے آب کی طرح لوٹنے لگے۔ جب ان کی حالت آپ سے باہر ہو گئی تو آواز آئی کہ ”اے میرے پیارے شکوہ اقبال کو سنبھال لے“ چنانچہ میں نے بڑھ کر انہیں اٹھایا اور گلے سے لگا لیا۔ دوبارہ گلے ملتے ہی ان کی حالت سدھر گئی اور وہ دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور ستوؤں سے بھرا ہوا گلاس پیش کر دیا۔

ہم نے بس ایک گھونٹ پیا اور باقی واپس کرتے ہوئے ہدایت کر دی کہ اس میں سے ایک گھونٹ بچے بچیوں کو پلا دیا جائے۔

پھر ہماری راز کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے بلھے شاہ کی دو کافیاں سنائیں جس پر شکوہ اقبال صاحب کی حالت پھر بگڑنے لگی۔ مگر میں نے فوراً گلے سے لگا لیا۔ پھر انہوں نے بھی اپنا ایک شعر سنایا۔ بڑا رلا دینے والا شعر تھا۔ ذہن سے اتر گیا ہے۔۔۔۔۔۔

ہاں یاد آیا۔

گیسو تابعدار کو اور بھی تابعدار کر
یا مجھے ہمکنار کر یا تجھے ہمکنار کر

میں واپس ہونے لگا تو آپ نے ستووں کا گلاس پھر آگے کر دیا۔ میں نے مسکرا کر واپس کر دیا۔ شکوہ اقبال صاحب میری اس رمز کو پہچان گئے اور خاموش رہے۔ چنانچہ جب داتا کے آستانے پر آیا تو وہی ستووں سے بھرا ہوا گلاس مزار کے سرہانے پڑا تھا اور مجاور آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

اتنا کہہ کر شیخ جی کے مرشد زیر لب مسکرانے لگے اور شیخ نے گردن جھکا کر آہستہ سے ''ہو حق'' کا نعرہ مارا اور ان کے بھنچے ہوئے ننگے سینے پر تعویذ جھومنے لگا۔

''حضور میں بھی ایک بار شکوہ اقبال کے مزار پر حاضر ہوا تھا اور آپ کے سرہانے والی جالیوں میں سرخ اینٹوں کے پانچ دھاگے باندھ آیا تھا۔''

اور مرشد بولے۔

''اچھا کیا' اب کبھی جاؤ تو میری طرف سے بھی پانچ سبز دھاگے باندھ آنا۔''

شیخ جی کے مرشد نے بمشکل اپنی بات ختم کی تھی کہ تاش کی منڈلی میں سے ایک تیز آواز آئی۔

''ہت تیرے حکم کے نہلے میں پان کا دہلا مارا۔ اسے کہتے ہیں کھیل'' رحمو نے زور سے پتا پھینک کر کہا۔

''ماشٹر یہ تیری بلف چال تھی۔'' چوئی چمک اٹھا۔

''کس سور کے بچے نے بلف چال چلی ہے پہلوان؟ تاش کھیلتے ہوئے کہ سو رہے ہو۔''

شیخ جی کی دوکان کے سامنے کمیٹی کے نل کے نیچے شکرو پوتی اپنی کمزور انگلیوں سے پیالے میں پوست ملنے لگا۔ اس کے پوست کا ٹائم ہو گیا تھا۔ پہلے وہ دن میں صرف ایک بار پوست پیتا تھا مگر جب سے اس کا جوان بیٹا مرا' وہ دن میں کئی بار پوست پینے لگا تھا۔

وہ پوست پی کر حقہ لے کرنل کے پاس اپنی چھوٹی سی دوکان میں بیٹھ رہتا ہے۔ نیند اس کی آنکھوں میں مر چکی ہے۔ وقت ایک کبھی نہ ختم ہونے والا راستہ بن کر اس کے سامنے پھیل گیا ہے اور وہ رات بھر دوکان کے اندر بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہتا ہے اور گھڑی دو گھڑی کے بعد ہر راہ گیر سے پوچھ لیتا ہے۔

’’بابو جی کیا بجا آئے؟‘‘

وہ معلوم کرنا چاہتا ہے اس نے کتنا راستہ طے کیا ہے اور ابھی کتنا باقی ہے۔ مگر یہ راستہ اسے ہر پل، ہر گھڑی کے ساتھ بڑھتا پھیلتا محسوس ہو رہا ہے۔ کبھی کبھی اپنے جواں بیٹے کی یاد میں اس کا دل ابل سا پڑتا اور وہ بے اختیار گانے لگتا۔ اس کی آواز میں کوئی سر کوئی لے نہ ہوتی۔ ایسے معلوم ہوتا جیسے وہ ہچکیوں اور آنسوؤں کے تار پر اپنے بیٹے کے بین کر رہا ہے۔

شیخ جی نے بوڑھے شکرو کو پوست ملتے دیکھا اور اپنے مرشد کے پاؤں دباتے ہوئے جھک کر کہا۔ ’’نشہ ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ مگر اس بوڑھے کو دیکھیے دن میں کئی کئی بار پوست پیتا ہے۔ اس بڈھے نے تو بیٹے کی موت سے بھی سبق حاصل نہیں کیا۔‘‘

ان کے مرشد نے شکرو پوسی کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر فرمایا۔

’’خدا اس بوڑھے کو عقل دے۔ یہ عمر نیک کاموں کے لیے ہے، پوست پینے کے لیے نہیں۔‘‘

اور شیخ جی اپنے مرشد سے کہنا چاہتے تھے۔

’’پوست کی بجائے اگر دوپہر کو ذرا سی بھنگ پی لی جائے تو کیا حرج ہے۔ اس طرح وقت بھی خوب کٹتا ہے اور خدا سے تار بھی ملی رہتی ہے۔‘‘

مگر انہوں نے خاموشی سے ہی کام لیا اور اپنے مرشد کے پاؤں دباتے رہے۔ ان کے مرشد منہ میں ہی کچھ بڑبڑائے۔ انہوں نے اپنے سینے پر ایک پھونک ماری اور بولے۔

’’لو شیخ جی ہم ایک اور مسئلہ بتاتے ہیں۔‘‘

شیخ جی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

’’دنیا میں چند ایک آدمی جانتے ہیں کہ سکندر اعظم مسلمان تھا اور اس نے خواجہ خضر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور اس کا اصلی نام سکندر اعظم علی تھا۔ جن دنوں اس کی فوجیں ہندوستان میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھیں اس کی عادت تھی کہ وہ مہینہ میں ایک بار فقیرانہ لباس میں گاؤں گاؤں کسی خدا رسیدہ بزرگ کی تلاش میں گھوما کرتا تھا۔

ایک بار قصہ یوں ہوا کہ ماموں کانجن کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اسے پیاس نے لاچار کر دیا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو ذرا فاصلے پر ایک آدمی کو بدن پر تیل کی مالش کرتے دیکھا۔ سکندر اعظم علی اس شخص کے پاس جا کر رک گیا اور گویا ہوا۔ ''اے شخص مجھے پیاس نے لاچار کر دیا ہے' کچھ پلاؤ تا کہ میرے جگر کو ٹھنڈک پہنچے۔''

اجنبی شخص مالش کرتے کرتے رک گیا۔ اس نے ایک زمین دوز مٹکے میں سے کٹورہ بھر کر کانجی سکندر اعظم کو پیش کی۔ کانجی پی کر سکندر اعظم علی نے پوچھا۔

''اے اجنبی! مجھے اپنا نام تو بتاؤ۔''

اس شخص نے ایک سرد آہ کھینچی اور پھر چھوڑ دی اور بولا۔

''اے شخص! مجھ بدنصیب کو حاتم طائی کہتے ہیں۔ تم نے اس خاکسار کی سخاوت کے قصے کتابوں میں ضرور پڑھے ہوں گے۔ بس میں وہی ہوں۔''

سکندر اعظم علی بہت خوش ہوا اُس نے پوچھا۔

''حاتم طائی! تجھے کون نہیں جانتا مگر اللہ مجھے جلدی بتا تو تیل کی مالش کیوں کر رہا ہے؟ کیا تیرے بدن میں خشکی ہو گئی ہے؟''

اس پر حاتم طائی نے ایک اور سرد آہ کھینچی۔

''اجنبی مسافر! جا اپنا کام کر تو میری داستان سن کر کیا کرے گا؟'' لیکن جب سکندر اعظم علی نے بے حد اصرار کیا کہ اس پر تیل مالش کا راز منکشف کیا جائے تو حاتم طائی بزبان خود گویا ہوا۔

''اجنبی مہمان! آج سے ٹھیک چودہ برس پہلے میرا پیارا محبوب اسی جگہ کھڑا مجھ سے ہم کلام تھا جہاں اس وقت تم کھڑے ہو۔ ہم عشق و محبت کی باتوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک میرے محبوب کو کچھ خیال آیا اور مجھ سے اتنا کہہ کر جدا ہو گیا۔۔۔۔۔۔ پیارے! تو یہیں ٹھہر میں ابھی آیا۔۔۔۔۔۔ آہ! اسے گئے چودہ برس ہونے کو آئے ہیں جب سے لے کر اس وقت تک میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس امید پر کہ نا معلوم میرا محبوب کس وقت اچانک واپس آ جائے۔۔۔۔۔۔ اور یہ مالش کا مشغلہ میں نے محض اس لیے رکھ چھوڑا ہے کہ کہیں کھڑے کھڑے میرا بدن سوکھ نہ جائے' مبادا میں اپنے محبوب کے در سے دھتکار دیا جاؤں۔''

اتنا سن کر سکندر اعظم علی پر وجد طاری کی حالت طاری ہو گئی۔ اس نے دلدوز چیخ ماری اور بے بیہوش ہو گیا۔ اس وقت اسے آواز آئی۔

اور پھر یوں ہوا کہ اچانک سامنے والی گلی سے جھنڈاں کی آواز آئی۔

''نی جھیماں۔۔۔۔۔۔۔''

اور شیخ جی کی تار ایک دم اپنے مرشد سے ٹوٹ کر جھنڈاں سے جا ملی۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے ان کی جھنڈاں دیر سے انہیں پکار رہی ہے۔ ''شیخ جی۔۔۔۔۔۔۔ شیخ جی۔۔۔۔۔۔۔ شیخ جی!!!''

رحمو قلعی گر جس نے ایک کا حرف لگا دیا تھا' حقے کی نے منہ میں دبائے سوچ رہا تھا۔

''جانے آج کیا آواز آئے؟''

◆◆◆

ایک رات

رات سر پر آئی تھی۔ اور میں شہر کی سڑکوں پر بے یارومددگار پھر رہا تھا۔ پچھلی رات سے میرے پیٹ میں سوائے پانی اور چائے کی پیالی کے کچھ نہ گیا تھا۔ علاوہ ازیں میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ اور آخری سگریٹ میری انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔ امید کی آخر کرن بھی بجھ رہی تھی۔

اتنے بڑے شہر میں میرے پاس کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ جہاں نومبر کی سرد رات بسر کی جا سکے۔ اس سے پیشتر جبکہ راتیں خوشگوار تھیں۔ میں ایک باغ میں سویا کرتا۔ پھر نومبر شروع ہو گیا اور میں ریلوے ویٹنگ روم میں آ گیا۔ یہاں بوڑھے چوکیدار سے واقفیت ہو گئی۔ میں اس کے بیٹے کو انگریزی پڑھا دیا کرتا اور وہ مجھے آرام سے لمبے بنچ میں ٹھنڈے گدے پر سونے کی اجازت دے دیتا۔ مگر وہ بچہ اس قدر نکما اور ضدی تھا کہ مجھے مجبوراً ویٹنگ روم کو خیر باد کہنا پڑا۔ وہاں سے میں نے سیدھا خدا کے گھر کا رخ کیا جہاں تین دن تک مولوی صاحب لحاظ ہی کرتے رہے لیکن چوتھے روز انہوں بھی لمبی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے فرما دیا:

"برخوردار ماں باپ کا دل دکھانا گناہ ہے۔ اپنے گھر جاؤ۔"

اور میں چپکے سے اپنے گھر چلا آیا۔ یعنی پھر انہی لمبی چوڑی سڑکوں پر جو مجھ غریب کی راہ میں ہر قدم پر بچھ جاتی تھیں اور جن کی اڑتی ہوئی گرد میں دو ماہ سے بھٹک رہا تھا۔

جس سڑک پر میں چل رہا تھا وہ کافی کھلی اور بارونق تھی۔

کنارے کنارے سبز قمقموں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ جن کی پھیلی روشنی میں گزرنے والوں کے چہرے مدقوق دکھائی دے رہے تھے۔ لوگ گرم کپڑے پہنے جگمگاتی ہوئی دوکانوں میں خرید و فروخت میں مشغول تھے۔ کافی دیر ادھر ادھر آوارہ گردی کرنے کے بعد جب سردی تھکن اور بھوک نے میرے اعضاء پر مردنی سی طاری کر دی تو میں نے پھر خدا کے گھر کا رخ کیا۔ مسجد کے بڑے دوازے میں کھڑے ہو کر میں نے دیکھا کہ صحن بالکل خالی تھا اور بڑے کمرے کے محرابی دروازے پھولے ہوئے نمدوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ جوتا باہر اتار کر صحن کا ٹھنڈا فرش عبور کر کے میں نمدہ اٹھا بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔

گرم اور پرسکون فضا کے نرم لمس نے لپک کر میرے تھکے ہارے سرد جسم کو اپنی آغوش میں لے لیا اور میں گرتے گرتے سنبھلا۔

کمرہ بالکل گرم حمام بنا تھا۔ زمین پر بھورے رنگ کی چٹائیاں قرینے سے بچھی ہوئی تھیں۔ منقش چھت سے قیمتی جھاڑ فانوس لٹک رہے تھے اور سنگ مرمر کے منبر پر مٹی کے آبخورے میں گلاب کے پھول رکھے تھے۔ جن کی دھیمی دھیمی خوشبو فضا میں تیر رہی تھی۔ ایک کمزور لیمپ کی گدلی گدلی روشنی میں مسجد کا یہ کمرہ اس کے صحن کی طرح بالکل خالی پڑا تھا۔ جس جگہ میں گھٹنے چھاتی سے لگائے' اپنا سر بازوؤں کے حلقے میں چھپائے' سونے کی کوشش کر رہا تھا میرے قریب ہی جوتے رکھنے کا ڈبہ تھا۔ میرا ذہن شاں شاں کر رہا تھا اور نیند مجھ سے کوسوں دور تھی۔

اپنا سب کچھ ہندوستان میں چھوڑ آنے کے بعد اس اجنبی شہر میں میں دو ماہ سے در بدر پھر رہا تھا اور میرا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ایک بار پھر اپنے آپ کو خدا کے گھر میں پا کر میرا دل چاہا کہ ہاتھ باندھ کر بصد عجز و نیاز اس کے حضور میں ایک عرض کروں۔ میں پوچھوں کہ میں نے اس کے کس پیغمبر کی توہین کی تھی جس کی پاداش میں مجھے بھوک' سردی اور ذلت کے سنگلاخ میدانوں میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

میں نے نظریں اٹھا کر منزل کی طرف دیکھا جہاں مٹی کے آبخورے میں سجے ہوئے پھول مجھے بے زبان قیدیوں کی مانند دیکھنے لگے۔ میری نظریں خود بخود جھک گئیں۔ لیکن میرا جسم دکھ رہا تھا اور بھوک کی وجہ سے انتڑیاں پیٹ میں کانٹے دار جھاڑیاں بن کر چبھ رہی تھیں۔ میں نے سوچا کاش میں اتنا چھوٹا بن جاؤں کہ جوتے رکھنے والے ڈبے میں دبک کر سمٹ جاؤں اور ساری عمر وہیں پڑا رہوں اور کبھی باہر نہ نکلوں۔ میں نے بازوؤں کے حلقے میں سے ایک آنکھ کھول کر ڈبے کو دیکھا۔ اس میں ایک بھی جوتا نہ تھا۔ مجھے فوراً اپنے جوتے کا خیال آ گیا جسے مجھے خاص لگاؤ تھا۔ اور جس نے خستہ خالی کے باوجود ہر حالت میں میرا ساتھ دیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ اندر لانا بھول گیا تھا۔ جی میں آئی کہ باہر سے اٹھا کر اندر لے آؤں ورنہ وہ ٹھنڈ میں پڑے پڑے اکڑ جائے گا۔ لیکن اس گرم فضا سے نکل کر ٹھنڈے صحن کو عبور کرنے کے خیال ہی سے میرے بدن میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ میں اور اکٹھا ہو گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میں ابھی کوشش ہی کر رہا تھا کہ دروازہ آہستہ سے کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ میں زیادہ سمٹ گیا۔ خاموش کمرے میں کسی کے بوجھل قدموں کی چاپ سنائی دی جو بتدریج میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔

"کون ہو تم؟" اس آواز میں ترشی اور کھردرا پن تھا۔

میں نے سر اٹھایا۔ ایک مولوی صاحب جن کا قد ٹھگنا' جسم بھدا اور داڑھی مہندی رنگی تھی میرے اوپر جھکے کھڑے مجھے اپنی سرخ

سرخ غلافی آنکھوں سے گھور رہے تھے۔ میں خاموش رہا۔ کھردری آواز پھر بلند ہوئی۔

”کون ہو میاں؟“

اور میں نے سر جھکا لیا۔

”جواب کیوں نہیں دیتے خدا کے بندے؟“ اس دفعہ آواز کڑوی اور کرخت تھی جیسے کوئی نیم کے تنے پر کلہاڑی چلا رہا ہو۔

”میں آدمی ہوں جناب۔“

”بھئی آدمی تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ مگر تم ہو کون؟

”مسلمان ہوں۔“

”پھر وہی بات خدا کے بندے مسجدوں میں مسلمان ہی آتے ہیں۔ لیکن اصل میں تم کون ہو؟“

میں جھلا گیا۔

”میں ہوں خانہ بدوش دیوندر ستیارتھی کی کتاب کا سرورق۔

”لاحول ولا مولوی صاحب نے چکرا کر میری بات کاٹ دی ”تم ہندو ہو کیا؟“

”جی نہیں حضور۔۔۔۔۔۔۔۔ میں مسلمان ہوں‘ پردیسی ہوں اور یہاں رات بسر کرنا چاہتا ہوں۔“

”پناہ گزین ہو؟“ مولوی صاحب نے جھک کر پوچھا۔

”کچھ سمجھ لیجئے۔“

مولوی صاحب ایک دم سیدھے کھڑے ہو گئے۔

”تعجب‘ خدا کے بندے تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ برخوردار اگر ایسی ہی بات ہے تو کسی سرائے میں جاؤ۔ کیمپ میں جاؤ۔ خدا کا گھر ہرایرے غیرے کے لیے نہیں ہے اور پھر اس مسجد میں آئے دن چوریاں ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی پمپ کی ہتھی نہیں ہے تو کبھی نلکے کی ٹونٹی غائب۔ ان پناہ گزینوں کا کچھ ایسا تانتا بندھا ہے کہ جینا مشکل ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں میاں! اپنا راستہ پکڑو۔ مجھے بڑا دروازہ بند کرنا ہے۔“

میں دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ کم بخت یہ تو بڑا ہی اجڈ قسم کا مولوی تھا۔ مجبوراً اٹھا۔ گرم فضا میں دو تین لمبے لمبے سانس بھر کر معدہ گرم کیا اور صحن میں آ گیا۔ سرد ہوا اور ٹھنڈا فرش میرے استقبال کو آگے بڑھے اور میں نے جلدی سے کوٹ کا پھٹا ہوا کالر

چڑھالیا اور ہاتھ جیبوں میں داب لیے۔ باہر پڑے پڑے میرا جوتا واقعی اکڑ گیا تھا۔ تسمے باندھتے ہوئے میرا دل چاہا کہ کسی نہ کسی طرح پمپ کی ہتھی یا نلکے کی ٹونٹی کھول کر لے اڑوں مگر مولوی صاحب میرے سر پر ہی کھڑے تھے۔ اس امید کا بھی گلا گھونٹ کر میں چپ چاپ مسجد کے بڑے دروازے سے باہر آ گیا۔

باہر اب کافی سردی ہو گئی تھی اور لوگ تیز تیز قدم اٹھائے شاید اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ گھر جہاں ان کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور گرم کھانے اور گرم بچھونے ان کی راہ دیکھ رہے تھے۔ میں نے سرد آہ بھری اور سڑک کے کنارے چلنے لگا۔

ابھی تھوڑی ہی دور چلا ہوں گا کہ دفعتاً کسی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

’’معاف کیجیے گا۔ آپ کے پاس دیا سلائی ہو گی؟‘‘

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سلیٹی رنگ کے لمبے کوٹ میں ملبوس، سیاہ گھنگھریالے بالوں اور تیکھی ناک والا ایک نوجوان شخص مجھے چمکیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

’’ضرور ہو گی۔‘‘

اس کا رنگ سنہرا گندمی تھا اور چہرے پر شرافت عیاں تھی۔ سگریٹ سلگاتے وقت اس کی سیاہ بھنویں اکٹھی ہو گئیں اور تیکھی ناک چمک اٹھی۔ دیا سلائی واپس کرتے ہوئے وہ ذرا سا میری طرف جھک کر بولا۔

’’مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایک ہی سگریٹ تھا۔‘‘

’’کوئی بات نہیں۔‘‘

اور وہ اطمینان سے سگریٹ کا دھواں اڑاتا میرے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ اس کی چال پر وقار اور متوازن تھی۔ جیسے وہ فوج کا کپتان ہو اور رات کے وقت شہر میں گشت کرنے نکلا ہو۔ اس کے چوڑے اور مضبوط شانوں کا لطیف جھکاؤ اس کی رفتار میں دلکشی پیدا کر رہا تھا۔ ہم خاموشی سے چلتے گئے۔ ایک چوک کے پاس پہنچ کر غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا:

’’کیوں جناب اس شہر میں کوئی ایسی جگہ بھی ہے جہاں کرایہ ادا کیے بغیر رات کاٹی جا سکے؟‘‘

’’وہ ٹھٹھک گیا۔ ایک پل کے لیے رک کر اس نے مجھے غور سے دیکھا‘‘ کیا آپ واقعی بے گھر ہیں؟‘‘

’’جی ہاں--------بالکل بے گھر۔‘‘

’’تو میرے ساتھ آئیے۔‘‘

"اتنا کہہ کر وہ زیر لب مسکرایا اور مجھے ساتھ لیے ایک طرف گھوم گیا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید شخص مجھے اپنے گھر لے جا رہا ہے۔ اس کا گھر بھی اتنا ہی دلکش ہوگا جتنی کہ اس کی چال ڈھال ہے۔ میں دل ہی دل میں اس کے گھر کا نقشہ قائم کرنے لگا۔ ایک خوبصورت کھڑکیوں والا گھر جس کے کمرے کی دیواروں پر پھولدار کاغذ منڈھے ہوں گے اور جس کے باورچی خانے میں قسم قسم کے کھانے پک رہے ہوں گے۔ ہم دونوں ایک فرنیچر سے کھڑے ہوئے ڈرائینگ روم میں بیٹھ جائیں گے۔ وہ میز کے دراز میں سے پلیئرز تھری کا ڈبہ نکال کر میرے آگے رکھ دے گا اور گھنٹی بجا کر نوکر کو بلائے گا۔ نوکر دروازے والا پردہ اٹھا کر نمودار ہوگا اور وہ نوکر سے کہے گا:

"دیکھو شبراتی ہمارے مہمان کے لیے۔"

مگر نوکر سے کچھ کہنے کی بجائے اس نے میری طرف جھک کر کہا:

"یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں بھی آپ ہی کی ناؤ میں سوار ہوں۔ یعنی میرے پاس بھی اس شہر میں رات کاٹنے کو کوئی جگہ نہیں۔"

مجھ پر جیسے کسی نے گرم پانی کا تسلا انڈیل دیا اور ڈرائینگ روم کے قیمتی فرنیچر اور پلیئرز تھری کے سارے سگرٹوں کا ستیاناس ہو گیا مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا آدمی بھی میری طرح بے گھر ہوسکتا ہے۔

"خیر یہ باتیں چھوڑیئے۔ ہمیں یہ سوچنا ہے کہ رات کہاں ٹکا جائے۔ اتفاق سے میری جیب میں چند آنے محفوظ ہیں آپ کی جیب میں کچھ ہے؟"

میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر جلدی سے پاسنگ شو کی خالی ڈبی نکال کر پیش کر دی۔ جس پر وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔۔۔۔۔۔۔۔ کس قدر صحت منداور پرعزم تھا اس کا قہقہہ!

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اپنے گھر کا دروازہ کھول دیا ہے اور اندر بہترین کھانے بہترین سگریٹ اور بہترین بستر پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔

کوئی پروا نہیں ہم کہیں نہ کہیں پڑ رہیں گے۔ کیا ہوا اگر ہماری جیبیں خالی ہیں۔"

"بے شک۔"

میں نے جلدی سے لقمہ دیا۔ جیسے مجھے یقین ہوگیا کہ اگلے چوک میں ہم کسی کے ہاں مہمان بننے والے ہیں۔

اب ہم شہر کے گنجان حصے میں آ گئے تھے۔ بازار میں چند ایک پان سگریٹ بیچنے والوں کی دوکانیں ہی کھلی تھیں۔ ایک جگہ حلوائی

دوکان کے سامنے کڑاہی رکھے اسے کھرچ رہا تھا اور قریب ہی دو کتے اپنی دم ہلا ہلا کر ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے یہاں ایک چائے خانہ رات بھر کھلا رہتا ہے۔"

میرے ساتھی نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا:

"اسی بازار میں؟"

"میرا خیال ہے اسی بازار میں۔۔۔۔۔۔۔" وہ ذرا رکا۔ پھر فضا میں کچھ سونگھ کر ایک طرف نظریں جمائے ہوئے بولا:

"یہ چائے کی خوشبو تھی شاہد وہ رہا چائے خانہ۔"

ذرا فاصلے پر ایک دوکان کے ادھ کھلے دروازے میں سے پھیکی پھیکی روشنی باہر نکل رہی تھی۔ یہی وہ چائے خانہ تھا۔ جہاں میرا ساتھی رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ ہم لمبے لمبے ڈنگ بھرتے جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ دروازے کا آدھا پٹ کھلا تھا اور بقیہ آدھا حصہ ایک مستطیل وضع کے چبوترے نے روک رکھا تھا۔ چبوترے میں بنی ہوئی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں اور ان پر رکھی ہوئی میلی کچیلی کیتلیوں میں سے بھاپ اڑ رہی تھی۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کا مریل سا آدمی بیٹھا سر پر گلوبند لپیٹے ایک کیتلی میں چمچہ پھیر رہا تھا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے ہمارے شانوں پر گرم کمبل ڈال دیئے ہوں۔ مجھے مسجد کا نمدوں سے ڈھکا ہوا کمرہ یاد آ گیا چائے خانہ کی دیواروں کی سفیدی دھوئیں کے باعث گدلی ہو رہی تھی۔ ادھر ادھر پڑی ہوئی چند کرسیوں اور میزوں کے علاوہ درمیان میں ایک بوسیدہ سی دری بچھی ہوئی تھی۔ جس پر تین آدمی میلی میلی چادروں میں منہ سر لپیٹے' خاموشی سے حقہ پی رہے تھے۔ وہ یوں ایک دوسرے پر جھک کر بیٹھے تھے جیسے کسی خفیہ جماعت کے آدمی ہوں اور وہاں چھپ کر میٹنگ کر رہے ہوں۔ جہاں ہم بیٹھے تھے وہ جگہ نسبتاً صاف تھی۔ ہمارے ساتھ والی کرسی پر ایک جہلمی سپاہی میز پر سر رکھے بازو پھیلائے سو رہا تھا۔ لڑکی کی چھوٹی سی کنگھی اس کے لمبے سے بالوں میں لگی ہوئی تھی۔ اس کی لال پگڑی اس کے آگے پڑی تھی۔ وہ یوں سربسجود تھا گویا اس پگڑی کی پوجا کر رہا ہو۔

سامنے والی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی بنچ پر کوئی شخص پھٹے پرانے لحاف میں گھسا میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز چائے کی خاموش فضا میں صاف صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے اس آدمی کی میٹھی نیند پر رشک آنے لگا۔

پرانی پیالیوں میں چائے انڈیلتے وقت مجھے اپنے ساتھی کی کلائی سے بندھی ہوئی سنہری گھڑی دکھائی دی جو رات کے پونے بارہ بجا رہی تھی۔

”میں کبھی کبھی یہاں رات بسر کرنے آ جاتا ہوں۔“

اس نے ایک پیالی میری طرف سرکا کر کہا:

”رات کاٹنے کے لیے اس سے اچھی جگہ شہر بھر میں کہیں نہیں۔ تم کچھ پیو نہ پیو۔ یہاں آ کر بیٹھے رہو۔ اگر نیند آ جائے تو اس سپاہی کی طرح میز پر سر رکھ کر سو جاؤ۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ پیسہ لگے نہ کسی کا احسان اٹھایا اور رات بھی مفت کٹ گئی۔“

وہ مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ چائے ایسی تھی، گرم اور خوشگوار وہ ہونٹ پیالی کی باریک سطح سے لگائے مزے مزے چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ چند گھونٹ پی کر اس نے پیالی میز پر رکھ دی اور ملازم لڑکے کو آواز دی:

”آدھی ڈبی گولڈ فلیک۔“

جب لڑکا باہر نکل گیا تو وہ کہنے لگا:

”میں ہمیشہ بہترین سگریٹ پیتا ہوں اور اگر میری جیب خالی ہو تو میں کچھ نہیں پیتا۔ میں تمہیں بھی یہی کہوں گا۔ ہمیشہ بہترین سگریٹ پیو اور بہترین عورت سے محبت کرو لیکن چائے کسی ایسی ہی جگہ بیٹھ کر پیو۔ جو مزہ اور تسکین تمہیں یہاں نصیب ہوگی اسے تم شہر کے بڑے سے بڑے ہوٹل میں بھی نہ پاؤ گے۔ یہاں تمہیں سکون اور ذہنی آسودگی کا احساس ہوگا۔ جس شہر میں ایسے چائے خانے نہیں ہیں میرے خیال میں وہ سگریٹ کی خالی ڈبی ہے، بانجھ عورت ہے سٹاک ایکسچینج کی مارکیٹ ہے اور یا کسی انشورنس کمپنی کا دفتر ہے۔“

میں اپنے ساتھی کی گفتگو میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے وہ کہاں تھا اور اس کے بعد کہاں جائے گا؟ اور جب میں اس سے اتنا پوچھا تو اس کے چہرہ پر افسردہ تبسم پھیل گیا اور وہ پیالی میں اسے اٹھتی ہوئی بھاپ کو دیکھنے لگا۔ اس کی خاموشی زیادہ گہری اور پر سکون ہو گئی۔ جیسے وہ اپنے گمشدہ ماضی کی تاریک ڈھلوان میں اتر گیا ہو۔ سر اٹھا کر اس نے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی غمگینی جھلک رہی تھی۔ کھلی پیشانی پر دو تین سلوٹیں زخموں کے نشان سے بن کر ابھر آئی تھیں۔

”اس سے پہلے میں ہندوستان میں تھا۔ میں اگرچہ پناہ گزین ہوں مگر مجھے اس نام سے چڑ ہے۔ نفرت ہے میں قریباً اڑھائی مہینوں سے بھوک، افلاس اور گمنامی کے بیکراں سائبیریا میں بھٹک رہا ہوں۔ میں ایک جلاوطن ہوں مجھ سے میرا گھر، میرا ماحول جدا کر دیا گیا ہے۔ میں نے زندگی بھر میں کوئی رات اس طرح چائے خانوں میں نیند اور بیداری کے درمیان لٹک کر نہیں گزاری۔ یہ کی کی

بات ہے میرا اپنا گھر تھا۔ میری اپی ایک سلطنت تھی۔ چھوٹی سی سلطنت چھوٹا سا گھر۔۔۔۔۔۔۔۔ شہر کی پرشور فضا سے باہر، پرانے باغ کے عقب میں سفیدے اور املتاس کے لمبے درختوں میں گھرا ہوا، تنہا پرسکون اور خاموش جس کے روشندان عشق پیچاں کی نرم نرم بیلوں سے ڈھکے ہوئے تھے اور جس کی اونچی اونچی ڈھلوانی چھتوں پر درختوں کے گہرے گہرے سائے تھے۔ مارچ کے شروع میں املتاس کی شاخوں پر زرد پھولوں کے گچھے جھولنے لگتے اور ان کی دھیمی دھیمی مہک ہمارے گھر میں پھیل جاتی۔ ہمارا گھرانہ، میری بیوی، ماں اور دو بچوں پر مشتمل تھا۔ ہم امیر نہیں تھے۔ پہلے ہمارا گھر گنجان شہر کے اندر ایک تنگ و تاریک گلی میں تھا۔ اس گلی میں، جہاں دھوپ کبھی نہیں آئی تھی ہم کئی سالوں سے مقیم تھے۔ لیکن میرے دل میں ایک ننھی سے خواہش مدت سے پرورش پا رہی تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ اس گندے اور تاریک ماحول سے باہر، چمکیلی دھوپ اور کھلی فضا میں اپنا ایک گھر ہو چھوٹا سا گھر۔ جس کے ہمسائے گہری چھاؤں والے درخت اور پھول اور خوش الحان پرندے ہوں۔ جہاں زندگی کا نام ایک ایسا خواب ہو جو تاروں کی چھاؤں میں گھاس اور پتوں پر لیٹ کر دیکھا جائے اور جس کا شہر کی گندی، متعفن اور اندھیری گلیوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس خواہش اس آرزو کی تکمیل کے لیے میں اپنے کاروبار کی ترقی میں دن رات جت گیا اور کچھ دیر بعد میری آرزو کی دلہن کی مانگ سیندور سے بھر گئی اور ایک روز ہم پرانی اور تاریک گلیوں کو خیر باد کہہ کر اپنے نئے گھر میں اٹھ آئے۔

گھٹی گھٹی سرد اور بیمار فضا سے نکل کر کھلی اور روشن فضا میں آنے پر ہم بے حد مسرور اور تازہ دم تھے۔ میری بیوی دن بھر نئے گھر کی آرائش میں لگی رہتی۔ آج کھڑکیوں کے جالی دار پردے بن رہے ہیں تو کل گملوں میں عشق پیچاں کی بیلیں لگائی جا رہی ہیں۔ ہمارے آس پاس کی اور گھر بھی تھے۔ جن میں رہنے والے بڑی بڑی ملوں اور فرموں کے مالک تھے لیکن ہمارا ان سے کوئی میل جول نہ تھا۔ ہمارے ملنے والے اسی اندھیری اور گندی گلی کے لوگ تھے جن کے ڈھیلے ڈھالے جسموں اور زرد چہروں والی عورتیں اکثر میاں بیوی کے پاس آیا کرتیں۔ ہم انہیں لوگوں میں سے تھے۔ اگر کچھ فرق تھا تو محض اتنا کہ وہ اپنے تاریک گھروندوں میں رہتے ہوئے مطمئن اور کسی بہتر ماحول کی جستجو سے بے نیاز تھے۔ لیکن ہمارے دلوں میں اس ماحول سے گزر جانے کی آرزو تھی، تڑپ تھی، لگن تھی کاش ہر آدمی کے دل میں اس تڑپ اس لگن کی شمع روشن ہو جائے پھر تم دیکھو گے کہ تمہارا شہر کچھ عرصہ گزر جانے پر کتنا دلکش اور خوبصورت ہو گیا ہے اور اس شہر کے باسی کس قدر صحت مند اور مسرور۔

میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ ہمارا گھر ہمیں بڑا پیارا تھا اور اپنا کمرہ شاید مجھے اس گھر سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ میری الماری دنیا کی چنی ہوئی کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ میرے ملنسار بھی زیادہ تر اپنے محلے کے آدمی تھے درزی، عطار، نانبائی، کپڑا اور جوتے بیچنے والے

غریب طالب علم اور مسکین کالر۔

یہ لوگ اگرچہ بے جان، غریب اور زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے تاہم ان سے مل کر، ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے ایک عجیب طرح کا سکھ اور آنند نصیب ہوتا تھا۔ یہ سکھ اور آنند مجھے ان بڑی بڑی ملوں کے مالکوں اور ان کے لونڈوں سے مل کر کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔ یہ لوگ احمق، چھچھورے اور ہر لحاظ سے گھٹیا قسم کے تھے اور ان کی عورتیں ایسی سج دھج مجھے کبھی نہ بھائی تھی۔"

وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ لڑکا سگریٹ لے آیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور مزے مزے سے کش لینے لگا۔ میں خیال ہی خیال میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا اس کی بیوی کھڑکیوں کے جالی دار پردے تیار کر رہی ہے اور وہ صحن کے باغ میں پودوں پر جھکا ان کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہے۔ مکان کی سرخ رنگ کی ڈھلوانی چھتوں پر درختوں کی پرسکوں چھاؤ ہے۔ املتاس کی شاخوں پر زرد رنگ کے پھول اور انگوروں کے گچھوں کی مانند لٹک رہے ہیں۔ گھر کے اندر سجے ہوئے درخت خوبصورت اور سادہ کمروں میں ایک تسکین بخش خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی بوڑھی ماں، برآمدے میں بیٹھی کچھ ہی سی رہی ہے۔ ایک لڑکا نیکر پہنے، پانی سے بھرا ہوا جگ لیے باورچی خانے کی طرف جا رہا ہے۔ جہاں سے مسالے دار کھانوں کی تیز تیز خوشبو مجھ تک باآسانی پہنچ رہی ہے۔

میرے پیٹ میں ناف کے نیچے کوئی شے سکڑ کر لکڑی کے ٹکڑے کی طرح مجھے چبھنے لگی۔ میں نے جلدی سے اپنی پیالی کے دو لمبے گھونٹ بھرے اور اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ گہری اور ہموار آواز میں بولا:

"پھر فسادات شروع ہو گئے۔ ہمیں آزادی مل گئی اور ہمارے پیارے گھر کو آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ہم لوگ بمشکل جانیں بچا کر پاکستان پہنچ سکے۔

ہم اب پاکستان میں ہیں۔ میری ماں، بیوی اور میرے بچے میرے ساتھ نہیں وہ لوگ یہاں تیس میل دور ایک چھوٹے سے قصبے میں مقیم ہیں۔ انہیں وہاں چھوڑ کر میں یہاں پھر کاروبار کی فکر میں چلا آیا ہوں۔ ہفتہ بھرے سے اس پرائے دیس کی سڑکوں پر در بدر پھر رہا ہوں اور ابھی تک میرا کوئی کام نہیں بن سکا۔ مگر میں ناامید نہیں ہوں۔ آج نہیں کل، کل نہیں تو پرسوں ایک نہ ایک دن اس خستہ حال، بھولی بھٹکی ناؤ کو کسی نہ کسی گھاٹ ضرور جا لگنا ہے۔

مجھ سے میرا گھر چھن گیا ہے۔ میرے املتاس کے درخت، زرد پھولوں کے فانوس اور بیلوں سے ڈھکے ہوئے روشندان بچھڑ گئے ہیں۔ روشن اور کھلی فضا سے اچھال کر کسی ان جانی طاقت نے مجھے ایک دفعہ پھر گندی اور اندھیری گلیوں کے تعفن میں پھینک دیا ہے۔ لیکن مجھے اس کا زیادہ افسوس بھی نہیں۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ پچھلی تمام باتوں کو بھلا کر مجھے آگے نظر ڈالنی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے

سے مجھے سوائے ناکامی تاسف اور غم کے اور کچھ نہیں ملے گا۔

میرے تاریک شب و روز میں سے تم شاید ہی ایسا کوئی لمحہ نکال سکو جو میں نے اپنی منزل کی طرف قدم اٹھائے بغیر گزار دیا۔ پہاڑ کی بلندیوں سے پاتال کی تہوں میں گرنے والی ندی کی مانند مجھے راستے کی تمام سنگین رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے سمندر سے جا ملنا ہے۔

ہاں۔۔۔۔۔۔۔میری زندگی کو وہیں سکون نصیب ہو گا۔

آج میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں۔ رات بسر کرنے کے لیے جگہ نہیں۔ مگر کل اسی شہر کے باہر، میرا ایک اپنا مکان ہو گا۔ جس کی ڈھلوانی چھتوں پر پہلے گھر کی طرح پسندیدہ درختوں کی چھاؤں ہو گی۔ روشندانوں پر میں خود اپنے ہاتھوں سے عشق پیچاں کی لچکیلی بیلیں چڑھاؤں گا۔ کھڑکیوں کے جالی دار پردے میری بیوی بنائے گی اور جس کے پائیں باغ میں رنگ برنگے پھولوں سے لدے ہوئے پودے صاف اور چمکیلی دھوپ میں جھوم رہے ہوں گے اور ان جھومتے ہوئے پھولوں کے درمیان میرے بچے آزادی، روشنی اور محبت کی گود میں پروان چڑھیں گے۔

آج ان میں سے کوئی ایک شے بھی میرے پاس نہیں، مگر کل ان میں سے ہر ایک شے میری عملداری میں ہو گی۔ میں زندگی کی کہر آلودہ گزار پر کھڑا، دونوں بازو پھیلائے بے تاب نگاہوں سے اس آنے والی کل کا منتظر ہوں۔ اس کشتی کی مانند جو گھاٹ پر کھڑی، اپنے بادبان کھولے، موافق ہواؤں کا انتظار کر رہی ہو۔''

میرا ساتھی رک گیا۔ سلگتے ہوئے سگریٹ کا دھواں دبلی پتلی لکیر کی شکل میں اوپر اٹھنے لگا۔ کسی اچانک آ جانے والے مہمان کی طرح اس کے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم نمودار ہوا اور وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا:

''کل رات بھر میں شہر کے اندر گلی کوچوں میں گھومتا رہا۔ چپ چاپ رات کے سائے میں، ان گلیوں کی مٹرگشت نے مجھے بڑا مزہ دیا۔ لیکن آوارہ کتوں اور پہرے داروں نے مجھے جلدی ہی وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔

مجھے ہر گلی میں داخل ہوتا دیکھ کر پہرے دار اپنا وزنی لٹھ زور سے زمین پر پٹختا اور للکار کر اگلے پہرے دار کو خبردار کر دیتا اور اگلا پہرے دار تیسرے پہرے دار کو میری آمد کی اطلاع دے دیتا۔ اس وقت کبھی تو مجھے اپنے تئیں چور ہونے کا گمان ہو رہا تھا اور کبھی پہرے داروں کی جمعدار کا، جو رات کے وقت ان کی دیکھ بھال کو نکلا ہو میں سوچتا ہوں لوگ ایک دوسرے سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟ انہوں نے اپنے گھروں میں کون سی ایسی شے چھپا رکھی ہے جس کی حفاظت کے لیے وہ رات بھر پہرے داروں کی چیخ و پکار سنتے

رہتے ہیں۔ تم میری اس بات پر دل ضرور ہنس رہے ہو گے۔ مگر میں سچ کہتا ہوں کہ انسان جس قدر ترقی کر رہا ہے وہ زیادہ بزدل اور ڈرپوک ہوتا جا رہا ہے اور ایک وقت آئے گا جب ایک انسان دوسرے انسان کو محض چھونے ہی سے موت کی نیند سلا دے گا وہ دور انسانی ترقی کا عروج دور ہو گا مگر ہمیں ان باتوں سے کیا؟ اس دور کے آنے تک ہماری ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہوں گی۔''

وہ زیر لب مسکراتا رہا۔ چائے خانے کی گھٹی گھٹی فضا میں اس کے خاموش الفاظ سگریٹ کا دھواں بن کر ہمارے سروں پر کالی سے تیرنے لگے۔ جہلمی سپاہی اپنی سرخ پگڑی کے آگے سر جھکائے بدستور سو رہا تھا۔ سامنے والی بنچ پر، لحاف میں کچھ کھسر پھسر ہوئی۔ خراٹوں کی راگنی پل بھر کے لیے رکی اور لحاف پھر ساکت ہو گیا۔ دری پر بیٹھے ہوؤں میں سے ایک آدمی وہیں دہرا ہو کر سو گیا تا۔ دوسرے آدمی نیند بھری آواز میں رک رک کر باتیں کر رہے تھے۔ ہماری میز تک ان کی مدھم بھنبھناہٹ ہی پہنچ رہی تھی الفاظ نہیں باہر چبوترے کی انگیٹھی پر جھکا کھڑا، پھٹی سرخ قمیض والا قلی بے دلی سے جلدی جلدی چائے ختم کر رہا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں گاڑی کا تصور تھا جو سامان اور مسافروں سے لدی پھندی، دھیرے دھیرے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔

قہوہ خانے کا مالک گدی پر اکڑوں بیٹھا اپنی غلافی آنکھیں بند کیے اونگھ رہا تھا اس کے چہرے پر افیون کا پیدا کیا ہوا پھیکا پن تھا اور وہاں سے بیچارگی اور بے بسی ٹپک رہی تھی۔ اگرچہ چائے نے کسی حد تک بھوک کا گلا دبا دیا تھا پھر بھی میری آنکھیں گرم گرم سی بھاپ خارج کر رہی تھیں۔ میں نے دو تین بار جلدی جلدی پلکیں جھپکیں اور میرا ساتھی مہربان نگاہوں سے دیکھ کر بولا:

''اگر نیند آ رہی ہے تو بے شک اپنا سر میز پر رکھ کر سو جاؤ۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔'' میں کھسیانا سا ہو کر آنکھیں ملتا ہوا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ میرا ساتھ مسکرانے لگا۔

''میں جانتا ہوں تم یونہی اس شہر کی خاک نہیں چھان رہے۔ تمہارا اسی سردی میں بے گھر بے آسرا پھرنا اور فاقہ کشی کے مصائب جھیلنا بے مقصد نہیں ہے۔ تمہارے دل میں ابھی امید کی ایک ننھی سی جوت جل رہی ہے۔ اس جوت کی مدھم سی چمک میں نے اس وقت دیکھ لی تھی جب دیا سلائی مانگنے کے لیے تمہاری طرف جھکا تھا۔ اگر میرا قیاس درست ہے تو میرے رات بھر کے دوست، کسی حالت میں بھی جی نہ چھوڑنا۔ تم نوجوان ہو۔ تمہارے بازوؤں میں طاقت اور خون میں گرمی ہے۔ اپنے خیالات کو اس طاقت اور گرمی کی کٹھالی میں ڈال کر انہیں ٹھوس اور قوی تر بنا لو۔ ہمیشہ بلند، مضبوط اور خوبصورت چیزوں کے متعلق سوچو اور زندگی کے اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو خواہ تمہارا کردار کتنا ہی مختصر اور غیر اہم کیوں نہ ہو۔''

اتنا کہہ کر اس نے دوسرا سگریٹ سلگایا اور کرسی پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ نیند روئی کے دھنکے ہوئے نرم گالوں کی مانند مجھے اپنی پلکوں پر

برتی محسوس ہو رہی تھی۔ کسی وقت ایک جھونکا سا آتا اور مجھے اپنا آپ ہلکے پھلکے دودھیا بادل کی طرح' پچھلے پہر کی پھیکی روشنی میں نرم ہواؤں کے دوش پر اڑتا ہوا محسوس ہوتا۔ میں نے سگریٹ سلگایا۔ تمباکو کا کڑوا پن جیسے میری آنکھوں میں اتر آیا۔ دفعتاً دری پر بیٹھے ہوؤں میں سے کوئی غمگین اور مدھم سروں میں گانے لگا۔

رہا کر دے مجھے صیاد ابھی فصل بہاری ہے۔

اس آواز میں درد اور تڑپ تھی۔ بلندیوں سے گرنے والی آبشار کی طرح مضطرب اور بے چین آواز نے چائے خانے کی رکی رکی سے فضا میں ایک درد انگیز تموج پیدا کر دیا۔ گیت ختم ہو گیا مگر گیت کا ہر بول' بے زبان فریادی بن کر جیسے ہمارے بیچ میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

میرا ساتھی بڑے غمناک لہجے میں بولا۔

''یہ ایک عجیب بات ہے۔ شعر و شاعری سے ذرا سا بھی لگاؤ نہ ہونے کے باوجود کسی وقت درد بھری لے سن پاتا ہوں تو دل بے اختیار بھر آتا ہے۔ میں نے کبھی کسی کی یاد میں آنسو نہیں بہائے۔ مجھے کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا پھر نہ جانے یہ کس انوکھے درد کا پرتو ہے جو کبھی کبھی آنسوؤں کی نمی بن کر میری آنکھوں میں امڈ آتا ہے۔ خاموشی اور یکسوئی کے ویران لمحات میں کئی بار ایک اچھوتے غم کا احساس ہوتا ہے۔ یہ غم رقص کرنے والی خوبصورت دیوادسیوں کی مانند مجھے اپنے طلسمی حلقے میں لے لیتا ہے اس وقت مجھے اپنا آپ کسی غیر فانی نغمے کے لے میں ڈھل کر کائنات کی ازلی و ابدی موسیقی سے ہم آہنگ ہوتا محسوس ہوتا ہے۔

میں نہیں جانتا اس غم کا سرچشمہ میری روح کی تاریک گہرائیوں میں ایک بار کہاں سے پھوٹ نکلتا ہے۔ میں صرف اس قدر جان سکا ہوں کہ نگاہوں سے اوجھل رہنے والے گمنام نشیبوں میں اس غم کے بادل دھیرے دھیرے اوپر اٹھ کر میرے دل کی چوٹیوں پر نمودار ہوتے ہیں اور جی کھول کر برس چکنے کے بعد خود بخود سرکتے ہوئے ان دیکھے سمندروں کی جانب روپوش ہو جاتے ہیں۔

یہ اجنبی اور انوکھا سوگ مجھے بڑا عزیز ہے۔

اس غریب الوطنی کے دور میں جبکہ میں اپنا سب کچھ لٹا کر تمہارے پاس اس چائے خانے میں بیٹھا' اپنی داستان بیان کر رہا ہوں تو میرا دل زخم خوردہ ہرنی کی طرح درد اور تکلیف کی شدت سے نڈھال ہے۔ جو شکاری کا زہر آلود تیر اپنے پہلو میں لیے کسی جھیل کے کنارے اکیلی کھڑی بے چینی سے ادھر ادھر تک رہی ہو۔

یہ سوگ' یہ کرب' یہ بے کلی اور یہ اضطراب میرا اور میری روح کا ایک حصہ ہے۔ یہ مجھ سے کبھی الگ نہ ہو گا' یہ میرے بازوؤں کی قوت

اور خون کی حدت ہے۔ دکھائی نہ دینے والے جنگلی عقاب کی مانند یہ ہمیشہ میرے دل پر محو پرواز رہے گا۔“

اس کی آواز دھیمی سی ہو کر ڈوب گئی۔ وہ چپ ہو گیا۔ جیسے رقص کرنے والی سیم تن دیوداسیوں کے ہجوم نے اسے اپنے طلسمی حلقے میں لے لیا ہو۔ اس نے انگلی کی خفیف سی جنبش سے سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور راکھ کا پھول میز پر گرتے ہی کھل اٹھا۔

نرم نرم دھنکی ہوئی روئی کے گالے بدستور میری پلکوں پر گر رہے تھے۔ کوئی غیبی ہاتھ نرم اور مہربان ہاتھ' مجھے محبت سے تھپکنے لگا اور میرا بوجھل سر خود بخود میز کی مٹیالی سطح سے جا لگا اور ہلکے پھلکے بادل کا دودھیا ٹکڑا' پچھلے پہر کی پھیلی روشنی میں نرم ہواؤں کے دوش پر سوار مشرقی لالہ زاروں کی سمت اڑنے لگا۔ اور میں سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرا ساتھی غائب تھا۔ دری پر تینوں آدمی میلی کچیلی چادروں میں گٹھڑیاں بنے سو رہے تھے۔ سامنے والے بنچ پر لحاف بدستور ساکت تھا اور خراٹوں کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ ملازم لڑکا کرسیاں ایک طرف لگائے فرش پر جھاڑو دے رہا تھا۔ چائے خانے کا مالک بھٹی میں سلاخ پھیر رہا تھا۔ جہلمی سپاہی کی میز خالی تھی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور باہر نکل آیا۔

باہر سرد رات ڈھل رہی تھی اور نیلے نیلے آسمان پر ستارے زیادہ شوخ اور زیادہ چمکیلے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جگہ مسجد کا سفید گنبد کے کافوری اجالے میں مصری کے کوزے کی طرح تاریخی میں جھلک رہا تھا۔

اگرچہ بھوک میری پنڈلیوں میں درد بن کر اتر آئی تھی اور میری آنکھوں میں لمبے لمبے سائے چل پھر رہے تھے پھر بھی میرا انگ انگ تازگی' شگفتگی اور مسرت کی ایک والہانہ کیفیت سے لبریز تھا۔

جیسے میں صبح کا ایلچی ہوں اور اس گندے شہر کے گھٹے گھٹے تنگ اور بے جان ماحول میں زندگی' حرارت' روشنی اور آزادی کا پیغام لے کر شبنم کے ہمراہ اتر آیا ہوں۔

میں نے بازو کھول کر بھرپور انگڑائی لی۔ میرا بھوکا' مگر سخت جسم گرم ہو کر جیسے شعلے میں بدل گیا اور مجھے اپنے ساتھی کے وہ الفاظ یاد آ گئے۔

”تمہارے بازوؤں میں طاقت اور خون میں گرمی ہے۔ جی نہ ہارو۔ ہمیشہ بلند' مضبوط و خوبصورت چیزوں کے متعلق سوچو اور زندگی کے اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو۔ خواہ تمہارا کردار کتنا ہی غیر اہم اور مختصر کیوں نہ ہو۔“

اور میں سینہ تانے' آنکھوں میں بھوک اور آہنی ارادے کی چمک لیے شہر کے دروازے میں اس تند اور بلا خیز لہر کی مانند داخل ہو رہا تھا جو بڑی سے بڑی چٹان سے ٹکرا جانے کا عزم لیے ہوئے ہو۔

◆ ◆ ◆

راون کے دیس میں

ہمارا اسٹیمر بڑی تیز رفتار سے لنکا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آسمان پر اکا دکا تارے نمودار ہونے لگے تھے اور سمندر کا گہرا سبز رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ آبی پرندے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ساحل کی جانب اڑ گئے تھے۔ مرطوب ہوا میں رچی ہوئی خنکی ہمارے کپڑوں سے موم بن کر چپک رہی تھی۔ تقریباً اڑھائی گھنٹہ کے پر سکون سفر کے بعد ہمیں دور۔۔۔۔۔۔ لنکا کے ساحل پر روشنی کے مینار کی جلتی بجھتی بتی نظر آئی۔ امی اور چھوٹا بھائی بے تابی سے اس روشنی کو دیکھنے لگے جو جگنو کی مانند پل بھر چمک کر پھر بجھ جاتی تھی۔ ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگے کھڑے اور مسافر بھی اسے اشتیاق بھری نگاہوں سے تک رہے تھے۔ جوں جوں ساحل قریب آ رہا تھا کئی اور جگہوں پر بھی دھندلی ابھرنے لگی تھیں۔

کھاڑی میں پہنچ کر سٹیمر نے دو تین بار وسل دیا اور ڈیک پر لگی ہوئی مشین گڑگڑاہٹ کے ساتھ لنگر پھینکنے لگی۔ گودی پر بالکل تیار کھڑے ادھ ننگے مزدوروں نے موٹے موٹے رسے ڈیک کی طرف اچھالے اور تھوڑی دیر بعد ہمارا اسٹیمر بڑے آرام سے کنارے آن لگا۔

یہ لنکا کی شمالی بندرگاہ ٹالی مینار تھی۔

گودی پر ایک طرف کولمبو ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ کسٹم والوں سے بمشکل تمام چھٹکارا پانے کے بعد جب ہم گاڑی میں سوار ہو گئے تو بائیں طرف ناریل اور سپاری کے درخت تلے چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں گراموفون ریکارڈ بجنے لگے۔

"ساون کے بادلو۔۔۔۔۔۔۔۔ اور مل کے بچھڑ گئی اکھیاں۔"

ہمارے چہرے اور مسرت کے ملے جلے احساسات سے چمکنے لگے۔ اپنے وطن کے گلی کوچوں میں سنے ہوئے گیتوں کی ایک ہی لے نے پرائے دیس کی اجنبیت کو زائل کر دیا اور ہمیں یوں معلوم ہونے لگا' گویا ہم کسی طویل سمندری سفر کے بعد اپنے وطن میں داخل ہو رہے ہوں۔

رات بھر کولمبو ایکسپریس برق رفتاری کے ساتھ جزیرہ سنگلدیپ کے مہیب جنگلات اور تاریک غاروں میں سے گزرتی رہی۔ منہ اندھیرے میری آنکھ کھلی تو گاڑی ایک معمولی سے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا کر باہر دیکھا۔

آسمان بھورے بھورے بادلوں کے لطیف نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی اور پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی سرخ بجری دھل کر چمک رہی تھی۔ بانس اور صنوبر کے نوکیلے پتے نکھر کر گہرے سبز ہو گئے تھے اور فضا میں ان کی سوندھی سوندھی مرطوب مہک بسی ہوئی تھی۔ سیلونی لڑکیاں، سپید ململ کے باریک کرتوں پر خوب کس کر دھوتیاں باندھے، ننگے پاؤں بالوں کے جوڑوں میں رنگ برنگے پھولوں کے گچھے لگائے، پان سگرٹ، سگار اور اناس کے قتلے بیچ رہی تھیں۔ ان کے رنگ زیادہ تر زرد، قد چھوٹے، مگر جسم گٹھے ہوئے مضبوط اور صحت مند تھے۔ ایک لڑکی اناس کے قتلے لے کر میری کھڑکی کے قریب آئی۔

”پائن ایپل سر۔۔۔۔۔۔۔۔ ویری سویٹ سر۔۔۔۔۔۔۔۔ فائیو سینٹ سر۔“

اس کا جسم بھی ایک چھوٹا سا پائن ایپل تھا، لیکن ابھی ویری سویٹ نہیں تھا، اس کی رنگت زرد زرد سنہری مائل تھی اور وہ ابھی پوری طرح پکا نہیں تھا۔ اس نے ابھی سورج کی کرنوں سے رس، پرسکون ٹھنڈی راتوں سے مٹھاس اور نیلگوں چاندنی سے رنگ حاصل کی تھی۔ میں نے ایک قتلہ لے کر پانچ سینٹ ادا کر دیئے۔ سینٹ اپنی انگیا میں چھپا کر وہ جلدی سے دوسرے ڈبے کی طرف مڑ گئی۔ یہ کام اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ پائن ایپل کتنا پک چکا ہے؟

گاڑی اس مضافاتی اسٹیشن سے چلی تو ایک دم بارش شروع ہو گئی اور دور دور تک سرسبز پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیاں دھندلا گئیں۔ نیچان کی وادیوں میں جہاں جہاں بانس کے گنجان جنگل کھڑے تھے، بارش کی دھواں دھار سی چادر تن گئی۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ پے در پے معمولی اسٹیشن چھوڑے جا رہی تھی۔ ہر بند پھاٹک پر ہمیں ناریلوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں، نیم برہنہ عورتیں اور مرد کیلوں کے گچھے یا پانوں کی ٹوکریاں اٹھائے نظر آتے۔ ایک جگہ ایک زرد اور نیلے رنگ کی بس دکھائی دی، جس کی پیشانی پر انگریزی الفاظ میں کولمبو لکھا تھا، ہم سامان وغیرہ درست کرنے لگے کولمبو قریب آ رہا تھا اور دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں اور بانس کے جنگلات کا قدرتی سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ ایک پتلی سی کالی چمکدار سڑک ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ نمودار ہو گئی تھی اور کہیں کہیں کوٹھے نما پکے مکانات بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جب کولمبو کا پہلا بڑا جنکشن مرادانہ آیا تو گاڑی تقریباً خالی ہو گئی۔ یہاں بھائی جان اور صدیقی صاحب مل گئے۔ ہمیں تین میل پر دوسرے جنکشن فورٹ اترنا تھا۔ یہ لوگ ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔ بھائی جان نے صدیقی صاحب سے میرا تعارف کرایا جو ملٹری ریڈیو پر ان کے مددگار اناؤنسر تھے۔

فورٹ پر ہم لوگ بھی اتر پڑے۔

گھر پہنچ کر تازہ دم ہونے کے بعد جب ہم صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے تو میں نے دیکھا کہ برسات کی مرطوب ہوا میں

ہمارے سامنے والی کوٹھیوں کے عقب میں ناریل اور پام کے چھریرے درخت ہولے ہولے جھوم رہے ہیں اور ایک طرف دیوار پر چڑھی ہوئی گنجان بیل میں سرخ سرخ پھول روشن ہیں۔ ہمارے سروں پر کیلے کے درختوں کے جھاڑی میں قرمزی پور لٹک رہے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے صدیقی صاحب کے بالوں میں سے یارڈلے ہیئر کریم کی مدھم خوشبو اٹھ رہی تھی۔

دوسرے روز صدیقی صاحب ماؤنٹ لیونیا لے گئے۔ اس مقام تک ریل سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ ہم سہ پہر تک وہاں رہے۔ شام کی چائے ہم نے تاڑ کے درختوں میں گھرے ہوئے لیونیا ہوٹل میں پی اور پھر کنارے والی گیلی ریت پر سگریٹ سلگائے گھومتے رہے۔ ہوا چل رہی تھی اور اس میں مچھلیوں کی بو تھی جیسے وہ سمندر کی سطح پر منہ نکالے لمبے لمبے سانس لے رہی ہوں۔ سبک رفتار لہریں ساحل پر جابجا بکھری ہوئی بھورے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں تک آتیں اور ان کے گرد حلقے کی صورت میں گھوم کر، جھاگ اڑاتی واپس چلی جاتیں۔

لیونیا کلب کے باہر دو تین انگریز عورتیں نہا رہی تھیں، کھلی ہوئی دھوپ میں ان کے سرخ و سپید جسم چمک رہے تھے۔ ناریل کے لمبے لمبے، جھومتے ہوئے درختوں کی بے ڈھنگی قطاریں کنارے کنارے دور تک چلی گئی تھیں۔ ان درختوں تلے سیلونی عورتیں، مدراسی عورتیں، اینگلو انڈین عورتیں، خوبصورت اور بدصورت عورتیں اپنے مردوں، غیر مردوں، پچکے ہوئے گالوں اور سوکھی ہوئی ٹانگوں والے مردوں کے بازوؤں میں بازو ڈالے اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔ گہرے سبز سمندر کے بیکراں سینے پر دور ایک مچھلی پکڑنے والی کشتی کے دودھیا بادبان ہوا میں جھول رہے تھے۔

ہم سگریٹ پیتے لیونیا اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔

ہمارے قدم سیلی ریت پر نرمی سے پڑ رہے تھے، ہماری دائیں جانب چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں کے باہر سیاہ گھنگریالے بالوں والے پستہ قدم آدمی، جن کے جسم کی کھال کروم لیدر سے ملتی جلتی تھی، بیٹھے ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ کروم لیدر کے جوتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور ان لوگوں کے جسم بھی بڑے مضبوط تھے۔ ان کی دبلی پتلی مگر محنتی جسموں والی عورتیں کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

صدیقی صاحب نے بتایا۔

"یہ لوگ لنکا کے اصلی باشندے ہیں، لیکن شہروں نے انہیں سمندر کے کنارے پھینک دیا ہے۔"

ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ بعض عورتوں کے سیاہی مائل جسم تنی ہوئی کمانوں ایسے تھے۔

سوائے ایک میلی سرخ دھوتی کے ان کے جسموں پر اور کچھ نہ تھا۔ دھوپ میں ان کے جسم سانپ کی کھال کی طرح چمک رہے تھے۔ اس چمک اور لیونیا کلب کے باہر نہانے والی انگریز عورتوں کی چمک میں رات دن کا فرق تھا وہ جسم نیلے نیلے سمندر کی شفاف جھاگ سے پیدا ہوئے تھے اور ان جسموں نے کچرا گلیوں کی سڑاند اور تعفن میں جنم لیا تھا اور اب یہ تعفن اور سڑاند سنگلدیپ کے ساحلی علاقوں میں پھیل رہی تھی۔ شاید اسے لیونیا کلب دلنواز موسیقی' بحر ہند اور خلیج بنگالہ کی پردیسی لہروں کو دور سے کھینچ لاتی تھی جس کے بال روم میں ہر ماہ کی آخری رات کو پانچ منٹ کے لیے تمام روشنیاں بجھ جاتی تھیں پھر رقص کرتے ہوئے نیم عریاں جوڑوں کے قدم خود بخود لڑکھڑانے لگتے اور پانچ منٹ کا مختصر وقفہ پومپیائی کی آخری رات میں تبدیل ہو جاتا' اور جب یہ قلیل عرصہ گزر جاتا اور پومپیائی کی آخری رات ختم ہو جاتی تو کوئی جوالا مکھی نہ پھٹتا' کسی طرف سے دہکتے ہوئے لاوے کا مہیب طوفان لیونیا کلب کو اپنی آتشیں لپیٹ میں نہ لیتا۔ وہاں ہر ماہ کی آخری رات پومپیائی کی اولیں رات تھی اور یہاں تاڑ اور ناریل کے درختوں تلے یہ کروم لیدر کے جسم' ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے اور میلی کچیلی دھوتیاں باندھے عورتیں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔ ایک نوعمر لڑکی جس کے بال اس کی پیٹھ سے بھی نیچے پہنچ رہے تھے' ایک ہاتھ میں بٹے ہوئے رسوں کا گچھا سا لیے ہمارے قریب سے ہو کر گزری' اس کے سیاہ جسم سے کچے ناریل کی رسیلی خوشبو اٹھ رہی تھی' اس نے جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر گردن گھمائی' اور ہمیں غور سے دیکھا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔

اس کی شربتی آنکھوں میں وحشی ہرنیوں ایسا الھڑپن اور معصومیت تھی۔

اس کا حسن کسی قدر کھردرا سا تھا!

اس کی آنکھیں کسی قدر نرم اور معصوم تھیں!

مجھے اناناس کے رسیلے قتلے یاد آ گئے۔ صدیقی صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا' پروگرام کا وقت ہو رہا تھا' ہم تیز تیز قدم اٹھاتے اسٹیشن پہنچے' وہاں سے فورٹ اور فورٹ سے بس میں بیٹھ کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔

ریڈیو اسٹیشن کی دو منزلہ عمارت کولمبو کی بیشتر عمارتوں کی مانند بدھی مندروں سے ملتی جلتی تھی عمارت کے اندر درمیان میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا' جہاں ناریل اور شریفے کی تین چار درخت تھے۔

برٹش سیکشن' ہندی سیکشن کے ساتھ ہی تھا' انگریز اناؤنسرز' نیوز ایڈیٹرز اور سکرپٹ رائٹرز دن بھر خالی نیکریں پہنے گھومتے رہتے تھے ان کے جسموں پر بھورے بھورے بالوں کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں' بعض جسموں پر چتکبرے داغ تھے انہیں دیکھ کر مجھے لگے

سڑے ٹماٹروں کا خیال آ جاتا تھا اور بڑی کراہت محسوس ہوتی تھی۔ ان میں دو لیڈی اناؤنسرز بھی تھیں۔ ایک انگریز لڑکی تھی جس کا نام فیلس ڈکنز تھا اور دوسری مسز کندا سوامی جو مدراس کی پیداوار تھی۔ فیلس ڈکنز کی آواز میں رس اور لوچ تھا اور اس کی سفید رنگت میں ہلکی سبزی کی جھلک تھی پکی خوبانیوں کی مانند۔

اس کے لہریا بالوں کا رنگ بھوسلا تھا' خزاں نصیب پتوں ایسا اور اس کی آنکھوں میں سبز اور نیلے رنگ کا دلکش امتزاج تھا۔ یہ روم کے ساحلی سمندروں کا رنگ تھا اور اس کی آنکھوں میں بحیرہ روم کی اتھاہ گہرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

مسز کندا سوامی کی آواز کافی اچھی تھی' مگر اس کا جامنی جسم دن بدن سوکھ رہا تھا' اس کے بال لمبے لمبے تھے' جنہیں وہ دو چوٹیوں میں گوندھے رکھتی تھی۔ لیکن اس کا نام ان بالوں سے زیادہ لمبا تھا اور جسے میں کبھی ایک سانس میں ادا نہیں کر سکا تھا۔ وہ ہر تیسرے روز نئی ساڑھی پہن کر آتی' اسے اپنی لوچدار آواز پر بڑا ناز تھا اور یہ آواز ریڈیو پر بڑے بڑوں کو دھوکا دے جاتی تھی۔ کاش وہ خود بھی اپنی آواز کی مانند ہوتی میرے ذہن میں اس کی آواز کا زندہ تصور فیلس ڈکنز کا مدور شانوں' ریشمی گالوں اور بھرے بھرے بازوؤں والا جسم تھا اور مجھے ہمیشہ مسز کندا سوامی کی آواز پر فیلس کی آواز کا دھوکا ہوتا تھا۔

فیلس ڈکنز سے میری پہلی ملاقات سٹوڈیو نمبر 3 میں ہوئی۔

میں اندر بیٹھا چند پنجابی ڈسکیں (Discs) ٹسٹ کر رہا تھا کہ فیلس کا نیم سبز آنکھوں والا اور نیم سنہری بالوں والا چہرہ دروازے کے چوکور شیشے پر نمودار ہوا' وہ بالکل کسی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ سٹوڈیو آف تھا وہ اندر آ گئی' آسمانی رنگ کے مہین لباس میں اس کی سپید شمیز کا ابھار کسی دودھیا بادل کے ٹکڑے کی مانند تھا جو کہرآلورات کے دھندلے آسمان پر چپ چاپ سو رہا ہو۔

ٹاپ کیا اور پروگرام چارٹ دیوار سے لٹکا کر وہ لاؤڈ سپیکر پر قدرے جھک کر کھڑی ہو گئی اور بڑے غور سے پنجابی موسیقی سننے لگی۔ طمنچہ جان ہی گا رہی تھی:

ہیر آکھدی جوگیا جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یار منا وندا ای۔

ڈسک ختم ہوئی تو وہ میرے قریں آ گئی۔

''یہ کیا گا رہی تھی؟''

فیلس میرے اس قدر قریب تھی کہ پونڈز کی خنک مہک میرے دماغ پر ایک خوشگوار کیفیت طاری کر رہی تھی۔

میں نے ڈسک لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا ''یہ ہی گا رہی تھی۔''

”ہی ارز؟“ ”یہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”یہ ہوتی ہے میڈم۔“

”تو یہ کوئی عورت۔“

”ہاں ہاں عورت یہ پنجاب کی جیولٹ ہیر کی محبت کا گیت تھا اور ہیر چوہدری چوچک کی بیٹی تھی اور چوچک چیکوسلواکیہ ------میرا مطلب ہے جھنگ مگھیانہ کا باشندہ تھا' اور برائے خدا اب یہ مت پوچھنا کہ جھنگ مگھیانہ کیا ہوتا ہے؟“

فیلس ہنسنے لگی۔ بے اختیار ہنسنے لگی اس کی ہنسی ایک بچے کی ہنسی تھی جو سوتے میں اپنے آپ مسکرانے لگے۔ معصوم' بے لوث' بے داغ۔ اس میں ایک خوابناک سرگوشی تھی' ایک والہانہ موسیقی تھی وہ مجھ پر ذرا جھک کر بولی ”کیا تم شاعر ہو؟“

میں اب پونڈز کی خوشبو کے علاوہ کچی خابونیوں کی نیم گرم' نیم ترش خوشبو بھی سونگھ رہا تھا' میں اسے کہنا چاہتا تھا' مادام میں شاعر نہیں ہوں' مگر میں کچی خوبانی کے عنوان سے ایک بھرپور نظم لکھ سکتا ہوں' کئی بھرپور نظمیں' کئی مثنویاں اور کئی دیوان لکھ سکتا ہوں۔ لیکن میں نے کہا ”مادام میں شاعر نہیں ہوں۔“

اور اچھوتے سیپ کا منہ پھر کھل گیا اور انمول' آبدار اور کنوارے موتیوں کی لڑیاں جھلملانے لگیں۔ وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں سٹوڈیو میں بیٹھا دیر تک کچی خوبانیوں کی نیم گرم' نیم ترش خوشبو سونگھتا رہا۔ جیسے میرے آس پاس ان کے ڈھیر لگے ہوں۔ میں نے برٹش پروگرام سننے کے لیے دوسرے سٹوڈیو کا بٹن دبا دیا۔ مسز کندا سوامی' انگریزی میں خریں سنا رہی تھی اور اس کی آوازی میں کس قدر رس اور لوچ تھا فیلس کے جسم کی مانند اس کی آواز کا لوچ اور گداز پن فیلس کے جسم کی یاد دلانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں خوبانیوں کے ڈھیر میں دبا جا رہا ہوں۔ میں نے جلدی سے سپیکر بند کر دیا اور سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔

ریڈیو گھر میں داخل ہوتے مس گلیٹی کی صورت دیکھنا پڑتی تھی۔

یہ چالیس پینتالیس سال کی ڈھیلے ڈھالے بدنما جسم والی عورت جس کے سر کے سفید بال خضاب کے مسلسل استعمال کی وجہ سے جامنی رنگ اختیار کر چکے تھے' صحن میں ٹیلی فون ایکسچینج کے سیٹ کے پاس بیٹھی تھی اور قریب سے گزرنے والے کو ایک بار اپنے پاس ضرور بلا لیتی تھی۔ ننگ دھڑنگ گوروں سے باتیں کرتے ہوئے اس کے بھدے چہرے پر کنواری لڑکیوں جیسا حجاب پھیل جاتا۔ میں اس کے کنواری لڑکیوں ایسے حجاب سے بڑا گھبراتا تھا۔ اس کا نام مجھے ہمیشہ فرانس کی گلوٹین کی خوفناک یاد دلاتا گلیٹی -------- گلیٹی اس نام میں گلے کو بڑے اطمینان سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی تھی۔ اس سے باتیں کرتے وقت میرے جسم میں سر سے پاؤں تک

کپکپی کا عالم طاری رہتا جیسے لوگوں کا ہجوم مجھے گلوٹین کی طرف کھینچے لیے جا رہا ہو۔ صدیقی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ گلا کٹوانے سے بال بال بچ گئے۔ وہ ایک ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے مس گلیٹی سے کسی نمبر کی بابت گفتگو کر رہے تھے کہ اس نے صدیقی صاحب کی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی دیکھ لی اور اس کا چہرہ کنواری لڑکی ایسے حجاب کے نقاب میں پہلے سے زیادہ بھدا ہو گیا۔

"مجھے یہ انگوٹھی بڑی پسند ہے مسٹر ڈکی۔"

اور مسٹر ڈکی نے گلوٹین کا تیز پھل اپنی گردن کے بالکل قریب محسوس کیا' انہوں نے آہستہ سے پوچھا "تمہاری عمر کیا ہو گی میڈم؟"

"قریباً پچیس سال۔۔۔۔۔۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے میڈم گلوٹین مسکرانے لگی اور کانچ کے بناوٹی دانتوں کی نیلی لکیر چمک اٹھی اور صدیقی صاحب تیزی سے کنٹرول روم کی طرف گھوم گئے۔

لنکا پہنچنے سے پہلے میں نے سونے کی اس سرزمین کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا' ایک حسین اور پراسرار خواب میں نے دیوپیکر فصیلوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پرسکون' چپ چاپ' آرام پسند شہر دیکھے تھے جن کے ارد گرد بانس' تاڑ' ناریل اور صنوبر کے گنجان جنگلات کا مہیب سلسلہ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا' جہاں بدھی مندروں کے سنہری کلس نکھری ہوئی دھوپ میں چمک رہے تھے' اور ان مندروں کے نیم روشن ایوانوں پر جلال دیوتاؤں کے سنگین مجسموں کے روبرو' کالی آنکھوں والی' سیم تن دیوداسیاں عود و عنبر کے نیلگوں دھوئیں میں بے خود ہو کر والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھی۔ موی روشنیوں کی ملائیم دھند میں ان کے نیم عریاں جسم پراسرار واہمے بن کر اجاگر ہو رہے تھے اور ان مندروں کے باہر مرمریں سیڑھیوں کے کناروں پر بیٹھی ہوئی بدھ کی کنواری بیٹیاں اندر جانے والے عقیدتمندوں کو گل صد برگ' موتگرہ' چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کر رہی تھی۔ ان کے سیاہ بال پھولوں میں لپے ہوئے تھے اور کانوں میں مجورا کے مندر لٹک رہے تھے۔

میں نے عظیم الشان محلات کی مرمریں بارہ دریوں میں شاہی رقاصاؤں کو اناس کی شراب میں بدمست آسمانی ناچ ناچتے دیکھا۔ ان بارہ دریوں کے جالی دار جھروکوں میں چکیلی بیلوں کی پھولوں بھری ڈالیاں داخل ہو رہی تھیں' باغوں میں ناریل اور آم کے پیڑوں پر رنگین پرندے چہچہا رہے تھے۔ جگہ جگہ کنول کی شکل ایسے دودھیا پتھر کے پیالوں میں چاندی کے فوارے ابل رہے تھے اور گلاب کے جھاڑوں پر سیاہ بھونروں کی ٹولیاں منڈلا رہی تھیں۔

مگر کولمبو میں سوائے ایک دھوبی کے اور کوئی شخص لنکا کے نام سے واقف نہ تھا۔ اس دھوبی نے اس خبر گیری کے ثبوت میں اپنی دوکان کی پیشانی پر ”لنکا واشنگ فیکٹری“ کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ لوہے اور کنکریٹ سے بنے ہوئے اس عظیم الشان شہر کے سنگین ہوٹلوں میں ملکی اور غیر ملی جوڑے شراب کے ہلکے ہلکے سرور میں ڈوب کر بے ربطگی سے ناچ رہے تھے۔ اور بدھی مندروں کے ویران ایوانوں میں چمگادڑیں غوطے لگا رہی تھیں۔ عود و عنبر کی نیلگوں دھند میں والہانہ رقص کرنے والی سیم تن دیوداسیاں اور مندروں کی سیڑھیوں پر گل صدبرگ، موتگرہ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کرنے والی، سیاہ بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی بدھ کی کنواری بیٹیاں اب کولمبو کی پتھریلی سڑکوں اور کارخانوں میں گھٹی ہوئی فضا میں دن بھر مشقت کرتی تھیں اور رات کو گندے تاڑی خانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تاڑی پیتی تھیں، لڑتی جھگڑتی تھیں اور نشے میں دھت ہو کر وہیں پڑ رہتی تھیں اور سونے کی لنکا کے بیٹے، راون کے غیور سپاہی، شہر سے باہر ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ شہروں نے انہیں کڑوی شے کی مانند تھوک دیا تھا۔ کونے کھدروں میں رینگنے والے کیڑے سمجھ کر انہیں دھرتی کے آخری کناروں پر پھینک دیا تھا اور سنگلدیپ کے لال، لنکا کے راج دلارے، سمندر کے کنارے، چمکیلی ریت پر شام کے بعد الاؤ روشن کر کے اس کے گرد بیٹھ جاتے اور ناچ گانے میں مگن ہو جاتے تھے۔ ڈھولک کی تیز تھاپ پر صدیوں کا پرانا غم ان کے تاریک سینوں کی تہوں سے لمبی، گہری اور درد انگیزی سروں میں ڈھل کر بہہ نکلتا۔ الاؤ کی تابناک روشنی میں ان کے نیم عریاں جسم کسی انوکھے، انجانے کیف میں بھیگ کر اپنے آپ جھومنے لگتے اور ان کے سروں پر ناریل کی ترچھی شاخوں میں چاند چمکنے لگتا۔ دودھیا چاندنی کے نقرئی خلاؤں میں لنکا کے بھوکے ننگے بیٹوں کے گیتوں کا طلسم مرمریں خواب بن کر پھیل جاتا۔ یہ خواب ایک خاموش اور پر سکون جھیل تھی، جس کی سطح پر ان کے جسم محبت، اخوت اور آزادی کے کنول بن کر تیر رہے تھے اور شہروں نے انہیں کڑوی اور گندی شے سمجھ کر سمندر کے پاس تھوک دیا تھا اور یہ اپنے وطن اپنے گھر میں بے وطن، بے گھر اور پردیسی لوگ الاؤ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کے ارد گرد بیٹھے کسی نئی تہذیب کا گیت گا رہے تھے۔ شاید وہ نیم خوابیدہ حالت میں منتظر نگاہوں سے اس وقت کی راہ دیکھ رہے تھے۔ جب اس تہذیب کا قافلہ سمندر کے بیکراں سینے پر اپنی کشتیوں کے بادبان پھیلائے ان کی سمت بڑھتا چلا آئے گا اور وہ آنکھوں میں مسرت کے آنسو لیے اس قافلے میں شامل ہو کر محبت، خوشحالی اور آزادی کا سنہرا خواب دیکھیں گے۔

ان کی نگاہوں میں انتظار کی بے کلی تھی اور ان کے گیتوں میں پہاڑ کی اونچانوں سے پھسلنے والی ندیوں ایسا اضطراب اور دفعتاً بھڑک اٹھنے والے شعلوں ایسا ہیجان تھا، تڑپ تھی، میٹھا اور عزیز ترین درد جو سیپ کے پہلی بار منہ کھولنے سے پیدا ہوتا ہے اور جب سیپ کا منہ کھل جاتا ہے تو فیلس ڈکنز مسکرانے لگتی ہے اور اچھوتے موتیوں کی آبدار لڑکیاں جھلملا اٹھتی ہیں اور یہ تبسم ایک چھوٹے سے

آبشار کی مانند فیلس کے سرخ ہونٹوں سے گلپوش وادیوں میں گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فیلس ہوٹل گال فیس کے بال روم میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور کوئی خوبصورت چرواہا آلوچے کی پھولوں بھری لمبی ڈالیوں کو ہلا رہا تھا اور سپید سپید‘ نرم نرم‘ کومل پتیاں گھاس پر گر رہی تھیں۔ آج فیلس کی سالگرہ تھی۔ روشنی میں اس کے بھورے بال سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ جیسے جنگل میں کسی مکڑی کے جال پر سورج کی نارنجی شعاعیں تھرک رہی ہیں۔ شمپین کا سلگتا سلگتا ہوا خمار اس کی آنکھوں کی نیم سبز جھیلوں پر صنوبر کا سایہ بن کر جھکا ہوا تھا او جھیلوں کا رنگ گہرا اور پراسرار تھا۔ ڈائس پر موسیقی شروع تھی۔ ایک پھولے ہوئے سرخ گالوں والی موٹی سی لڑکی پورا منہ کھولے گا رہی تھی۔

Night in june if I where never to see you again.!O

اس کی تیز اور کرخت آواز میں بیابانی عقاب جیسی جھپٹ تھی اور یہ عقاب اپنے خوفناک پنجے پھیلائے ہر آدمی کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ لوگ گانا سننے کی بجائے عورتوں سے فحش مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے اور عورتوں کی ٹانگیں رانوں تک ننگی تھیں‘ ان کے بازو شانوں تک کھلے تھے‘ اور سینے چھاتویں تک عریاں تھے‘ ہال میں گداز اور خمار آلود جسموں کی نیم گرم خوشبو رچی ہوئی تھی اور فیلس اپنی سالگرہ کا پانچواں جام خالی کر رہی تھی اور جھیل کی سطح پر تاڑ کے سائے زیادہ گہرے اور گدلے ہو رہے تھے۔ اس کی دائیں جانب بیٹھا‘ ریڈیو اسٹیشن کا موسیقار وکٹر پول دسویں بار اس کے ریشمی گال چوم رہا تھا۔ نیوز اناؤنسر ہیرس‘ تھوک میں بھیگا ہوا سگریٹ منہ میں دبائے‘ شراب میں تر انگلیاں اپنی کھوپڑی پر رگڑ رہا تھا اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شراب کے نشے میں گھٹ کر سکڑ گئی تھیں۔ لفٹن گرفن نے اپنا جام ہوا میں لہرایا اور فیلس کی سالگرہ کا بارہواں جام بھی خالی ہو گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتا فیلس پر جھکا اور اپنے شراب آلود لب اس کے نیم عریاں مرمریں سینے پر رکھ دیے۔ وکٹر بڑبڑاتے ہوئے گلاس میں شمپین انڈیلنے لگا اور ہریس نے اتنے زور سے کش کھینچا کہ گیلا سگریٹ ایک دم سکڑ گیا۔ فیلس کا مخمور جسم ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میری پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ہم ایشیائی طبعاً شریف ہوتے ہیں۔ ہم ایسے مناظر برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم محبت کرنے سے پہلے روشنی بجھا دیتے ہیں۔ ہماری محبت تاریکی اور تنہائی کے غار میں جنم لیتی ہے اور اسی غار میں دم توڑ دیتی ہے۔ ہمیں غاروں سے محبت ہے۔ محبت کے غار‘ نفرت کے غار‘ ذلت کے غار اور شرافت کے غار۔ ہم فطرتاً غار پسند ہیں اور یہاں روشنی ہی روشنی لوگ ہی لوگ۔

اور لفٹنٹ گرفن کے شرابی لب فیلس کے پتلے شبنمی ہونٹوں سے پیوست تھے۔ پھولے ہوئے سرخ گالوں والی امریکن لڑکی

بدستور چلا رہی تھی۔

Noight in june!O!

اور بیابانی عقاب اپنے خوفناک پنجے کھولے ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا' قریب ہی ایک میز پر کوئی نوعمر ملاح' نیلی اور سفید وردی میں ملبوس' کہنیاں گھٹنوں پر رکھے' ذرا آگے کو جھکا' ایک اینگلو انڈین دبلی پتلی بے زبان سی لڑکی سے اظہار محبت کر رہا تھا اور وہ لڑکی گائے کی زبان کے ٹھنڈے قتلوں پر ٹماٹر کی چٹنی لگائے انہیں چبا چبا کر کھا رہی تھی۔

ایک خاص سیلونی ادھیڑ عمر جوڑا بڑے دروازے پر نمودار ہوا۔ ویٹر نے ہاتھ پھیلا کر ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ عورت کا تھل تھل بھدا جسم جامنی رنگ کی ساری میں لپٹا تھا۔ اس کے مریل سے خاوند کا مختصر ہاتھ بمشکل اپنی بیوی کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ عورت کے ہونٹ سرخ تھے' گہرے سرخ خون کے رنگ ایسے گویا وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آ رہی ہو۔ اس کے بازوؤں پر کلائیوں پر گلے میں بیش قیمت ہیرے موتی جھلملا رہے تھے اس کے خاوند کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سوکھی گردن' قمیض میں سے خشک ٹہنی کی مانند باہر نکلی ہوئی تھی۔ سیلونی عورت نے ڈائیس پر گاتی امریکن لڑکی کو دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

لڑکی نے ایک دم گانا بند کر دیا اور عقاب نے اپنے پنجے سمیٹ لیے اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دفعتاً ہال کے درمیانی حصے کے سوا ہر طرف روشنیاں گل ہو گئیں اور ساز و پر ہلکے سلکے سروں میں کوئی اور ہی دھن شروع ہو گئی۔ ادھر ادھر میزوں پر سے نیم برہنہ عورتیں اور مدہوش مرد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنارے پر سے کھسکتی ہوئی کشتیوں کی مانند اٹھے اور ان کے جسم موسیقی کی پر سکون لہروں پر اپنے آپ ڈولنے لگے۔ سبز روشنی کے غبار میں ان کے لہراتے ہوئے جسم خواب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس پھیکے پھیلے اندھیرے کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے چہرے بڑے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گرم سلگتی ہوئی شرابی آنکھیں مدھم اندھیرے یں چمک رہی تھیں۔ ڈاکٹر وکٹر اپنے پیچھے کرسی گراتا ہوا اٹھا اور فیلس کو اپنے لمبے بازوؤں میں تھام کر محو رقص جوڑوں میں شامل ہو گیا۔ لفٹنٹ گرفن شراب سے بھرے گلاس میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر ناک سکیڑ کر بولا۔

''بدمعاش گویا۔''

ہریس نے پانچویں انگلیاں شراب میں ڈبو کر انہیں اپنی کھوپڑی پر رگڑا اور سر کرسی کی پشت سے لگا کر بازو لٹکائے بولا۔

''And This is the end of the news!''

گھومتیں' لہراتیں کبھی آگے بڑھتیں کبھی پیچھے سمٹتیں' سانولی' گندمی' زرد اور سپید عریاں پنڈلیوں کے ہجوم میں مجھے فیلس کی چکنی

چکنی پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وکٹر اسے اپنے ساتھ چمٹائے بڑے بھونڈے انداز میں ناچ رہا تھا اور فیلس کا شرابی جسم اس کے لمبے بازوؤں کی شاخوں پر پکی ہوئی انجیر کی مانند لٹک رہا تھا اور میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں سینک اٹھ رہا تھا۔ اردگرد میزوں پر اب صرف بوڑھے اور بدصورت چہرے ہی تھے؟ جھملاتے بیش قیمت‘ ہیرے موتیوں والی‘ بھاری کم سلونی عورت کا مجھے دور سے ہی خاکہ نظر آ رہا تھا۔ جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مریل اور زیادہ پھیکے خاکے پر جھکا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں سرخ سرخ ہونٹ پھر گئے۔ گہرے سرخ ہونٹ اور مجھے یوں لگا جیسے پہلا خاکہ دوسرے خاکے پر جھکا اس کا خون پی رہا ہو۔

گلاس کے بوتلوں سے ٹکرانے کی کھنکارین اور بوڑھے قہقہوں کی بے جان آوازیں‘ ڈانس کے لمبے لمبے سروں میں مدغم ہو رہی تھیں اور نیوز اناؤنسر ہیریس خبریں ختم کرنے کے بعد ٹانگیں پھیلائے مدہوش پڑا تھا۔ لفٹینٹ گرفن پی رہا تھا اور بی بی سی کے نئے ریکارڈوں کی دھنیں گنگنا رہا تھا۔ کسی وقت وہ اپنی گھٹی ہوئی آنکھیں اٹھا کر ہچکی روک کر مجھ سے پوچھتا۔

“Do you like Gpsyve songs”

اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کوئی اور دھن شروع کر دیتا۔ شیمپین کا جام میرے ہاتھوں میں ختم ہو رہا تھا اور فیلس کا جسم وکٹر کے سینے سے چمٹا ہوا تھا اور انجیر اپنی شاخ پر لٹک رہی تھی‘ وہ پک چکی تھی اور گرنے والی تھی اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گر پڑے‘ ہال کی تمام بتیاں ایک ساتھ روشن ہو گئیں۔ بوڑھے اور بدنصیب چہروں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے رقص کے ٹوٹتے دائروں کو دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ عورتیں اپنے ڈھیلے بلاؤز درست کرتیں پریشان بال سنوارتیں‘ مردوں کے سہارے اپنی اپنی میز کی سمت بڑھنے لگیں‘ وکٹر کے بالوں کی ایک لٹ اس کی چوڑی پیشانی پر جھول رہی تھی۔ فیلس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وکٹر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یوں اسے اپنے بازوؤں میں تھام رہا تھا جیسے فیلس کوئی مجسمہ ہو جس کے پاؤں تلے سے چبوترہ کھسک گیا ہو‘ وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور بے احتیاط ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی شراب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کسی جگہ نہ ٹھہرتی تھیں۔ وہ کبھی ہیریس کو دیکھتی‘ کبھی گرفن کو اور کبھی مجھے۔ جیسے ہمیں پہچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیفٹیننٹ گرفن پرانا شرابی تھا‘ چنانچہ اس نے اٹھ کر فیلس کو تھام لیا۔ وکٹر نے ہیریس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا‘ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بلند آواز میں بولا۔

“Here is the news!”

ہم سب ایک دوسرے کا سہارا لیے لڑکھڑاتے‘ ڈگمگاتے باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں ڈھیر ہو گئے۔ پرائیویٹ ہوسٹل کے احاطے میں آ کر ہم نے ہیریس اور فیلس کو بمشکل برآمدے تک پہنچایا۔ ڈائننگ روم میں پہنچتے ہی فیلس صوفے پر گر پڑی اور لیفٹیننٹ گرفن

اس کا سر دبانے لگا۔ ہیریس کا نشہ جیسے سو کر بالکل ہی اڑ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے گرفن کو فیلس پر جھکے دیکھا وہ گالیاں بکتا ہوا اٹھا اور اندر سے وائٹ جن کی ایک اور بوتل لے آیا' وکٹر پول آرام کرسی میں لیٹا ٹانگیں قالین پر پھیلائے بڑے مزے سے گا رہا تھا۔

"I Know where you sing o sea!"

میری آنکھیں جل رہی تھیں اور بند ٹوٹ رہا تھا۔ میرے اردگرد ہر شے دھندلا رہی تھی۔ وکٹر پول کے گانے کی نرم آواز جیسے کسی ویران اور اندھیرے کنویں میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آواز مجھ سے دور ہوئی جا رہی تھی دور اور دور یہاں تک کہ وہ بالکل ڈوب گئی اور میں سو گیا۔

جانے میں کتنی دیر سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وکٹر پول مجھے دوسرے کمرے میں کھینچے لیے جا رہا تھا۔ مجھے اندر دھکیل کر اس نے دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

"ان جوائے یو ایلیفنٹ بوائے۔"

میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں ملتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمزور لیمپ کی مدھم روشنی میں فیلس ڈکنز پلنگ پر بھورے رنگ کا ریشمی کمبل اوڑھے سو رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ کر آہستہ اس پر جھک گیا۔ فیلس کا رنگ زرد ہو رہا تھا' پتلے ہونٹوں پر پسینے کی ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالک بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کر نرمی سے ہلایا "فیلس' فیلس"

فیلس کی مخمور پلکیں آہستگی سے اوپر اٹھیں جن میں شراب کا سرور دھند بن کر چھایا ہوا تھا' وہ ہولے سے مسکرائی' میں نے اپنے ہونٹ اس کے نیم وا ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ شراب اور پسینے کے نمکین ذائقے نے میرا منہ بدمزہ کر دیا۔ میں نے کمبل منہ پر کر لیا' کیونکہ کمرے میں روشنی تھی اور ہم ایشیائی اندھیرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں روشنی راس نہیں آتی۔ لیکن کمبل منہ پر کرنے سے ایک عجیب قسم کی بو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی جیسے میں نے گندے ٹماٹروں سے بھری ہوئی بوری میں منہ ڈال دیا ہو یا جیسے میں کسی مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا ہوں وہ خوبانیوں کی میٹھی خوشبو کہاں گئی تھی' وہ پاؤڈر کریم کی ٹھنڈی مہک کہاں غائب ہو گئی تھی؟ میرا دماغ پھٹنے لگا' میں نے جلدی سے منہ باہر نکال لیا' لیکن باہر وہی روشنی اور ہم ایشیائی۔

میں جلدی سے مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا اور تمام رات وہاں بغیر ناک پر رومال رکھے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر جب میں مچھلی

مارکیٹ سے باہر نکلا تو ڈرائنگ روم میں لفٹنٹ گرفن، ہیریس اور وکٹر پول نیم برہنہ حالت میں، قالین پر الٹے سیدھے پڑے تھے۔ میں نے میز پوش اٹھا کران پر ڈال دیا اور ہوسٹل سے باہر نکل آیا، سڑک پر پہنچ کر مجھے فیلس کا ڈکنز کا خیال آ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نائی نے شیو کے بعد بالوں بھرا جھاگ میرے منہ پر پھینک دیا ہو میں نے زور سے تھوک دیا۔

ہماری ساتھ والی کوٹھی میں ایک اچھے خاصے بدصورت سیلونی بیرسٹر کی اچھی خاصی بدصورت بیوی رہتی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو خوبصورت عورتوں کی تصویریں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا۔ بھائی جان نے مجھے بتایا کہ اس کے ذاتی البم میں دنیا جہان کی عورتیں کی تصویریں، موجود ہیں اور وہ اس البم کو اپنی بیوی سے چھپا کر رکھتا ہے۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی آرام کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہتے ہیں وہ بولتے کم اور مسکراتے زیادہ تھے۔ بیگم صاحب کو پیانو سیکھنے کا خبط تھا۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر اپنے کمرے میں جا کر ذاتی البم کھول لیتا اور اس کی بیوی پیانو پر جا بیٹھتی، پھر ان کے گھر سے پیانو کے بھدے، کرخت بے ڈھنگے اور بے ربط سر سنائی دینے لگتے۔ جیسے وہ ان سروں کو دھکے دے دے کر باہر نکال رہی ہو۔ کسی وقت محسوس ہوتا وہ پیانو بجا نہیں رہی بلکہ اس سے جھگڑ رہی ہے اور جب پیانو کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو پردوں پر زور سے انگلی مار کر پوچھتی ہے "کیا کہا؟"

کبھی کبھی جی بے اختیار چاہتا ہے کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر رونے لگں، یہاں روشنا شروع کر دوں۔ جب حیران ہو کہ وجہ دریافت کرے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں، یہاں تک کہ وہ ڈر کر بھاگ اٹھے اور میں اطمینان سے آنسو پونچھ کر باہر نکل آؤں۔ وہ ہر رات بلا ناغہ گھنٹہ بھر پیانو سے لڑتی اور اس دوران میں اس کا خاوند جی کھول کر اپنی ذاتی المب کا مطالعہ کرتا۔ سامنے والی کوٹھی میں ایک عیسائی انجینئر کا کنبہ رہتا تھا۔

انجینئر کی دو لڑکیاں تھیں، ایک کی عمر بارہ سال ہوگی اور دوسری لڑکی سترہ اٹھارہ کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی لڑکی کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور آنکھیں بالکل بلی کی مانند۔ اس کی چال بھی بلی کی طرح سہمی سہمائی اور دبی دبی تھی اور ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی تھی۔ اس کی سیدھی اور چکنی پنڈلیاں بڑی سڈول تھیں۔ اس کے سینے کی گولائیاں ابھی بن رہی تھی اور ان کی طرف دیکھنے پر کسی وقت یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے قہوہ پینے والی دو پیالیاں قمیض کے اندر اوندھی رکھی ہوں۔

بڑی لڑکی کا رنگ زردی مائل گندمی تھا، وہ دبلی پتلی اور بے اختیار لمبی تھی۔ اس کی بائیں آنکھ ذرا ٹیڑھی تھی۔ اور ناک اس کے قد کا چوتھا حصہ تھی اس کا نام مس املی تھا۔ یہ نام سن کر مجھے ہمیشہ کھٹی املی کے درخت یاد آ جاتے اور منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اس کی آواز

تیز تیکھی اور کرخت تھی۔ وہ بولتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ریل کے انجن کا کوء پرزہ لیک کر رہا ہے اور تیز بھاپ سیٹی بجاتی خارج ہو رہی ہے۔ اسے اپنے مریل کتے سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر شام کوٹھیوں کے درمیان والی سڑک پر اسے ساتھ لیے ٹہلا کرتی تھی۔

چوک میں کسی بدھی بھکشو کی خانقاہ تھی جہاں ہفتہ میں کئی بار میلہ ہوا کرتا' اس روز عورتیں' بچے' مرد زرد لبادوں والے بھکشوہ خانقاہ میں جمع ہو کر دن بھر مذہبی گیت گاتے رہتے یہاں اکثر دیسی عطروں کی تیز خوشبو پھیلی رہتی تھی۔

اس خانقاہ کے عقب میں شہر کے غریب داڑے تھے۔ لڑکی اور گھاس پھونس سے بنے ہوئے ڈربہ نما مکانوں کے بیچوں بیچ ایک خستہ حال سرک پر چلی گئی تھی' اس سرک کا نام ٹمپل روڈ تھا۔ یہاں رات کو عموماً اندھیرا چھایا رہتا اور مکانوں کے اندر سرخ سرخ سبز بتیاں' ٹمٹماتی رہتیں' یہاں بجلی کے کھمبے ضرور تھے مگر بلب کسی ایک پر بھی سلامت نہ تھا۔ ایک جگہ ناریل کے درختوں تلے تاڑی خانہ تھا جہاں صبح و شام مزدور عورتیں اور مرد تاڑی پیتے' شور مچاتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ اس جگہ انہی ڈربہ نما مکانوں میں' چوری چھپے جسم بیچنے والیوں کے دلال رہتے تھے' ٹمپل روڈ دراصل قحبہ روڈ تھی۔ یہ کسی مندر کی طرف نہیں بلکہ کوٹھی خانوں کی طرف جاتی تھی۔ شام ہوتے ہی جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو رنڈیوں کے دلال' تاڑی کے نشے میں مگن کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح ٹمپل روڈ پر منڈلانے لگتے۔ کسی وقت وہ تاڑی کے درختوں تلے یا بجلی کے کھمبوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاتے اور بیڑی پیتے' اپنی خطرناک چمکیلی آنکھوں سے ہر راہ گیر کو گھورنے لگتے' پھر ایکا ایکی لپکتے اور کسی نہ کسی حاجت مند پر حملہ کر دیتے۔

”مرغی صاحب؟ ایک دم اچھا والا صاحب؟“

”اچھا والا“ سے مراد ایسی عورت ہوتی تھی جو پیشہ ور نہ ہو' بلکہ عطائی ہو۔

ایک روز میں ایک اچھا والا کے پاس چلا گیا۔

اس رات ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں' میں برساتی اوڑھے فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے سے ہو کر گزر رہا تھا' فضا میں درختوں کے گیلے تنوں کی مرطوب رچی ہوئی تھی۔ سڑک پر کبھی کوئی موٹر روشنی کا سیلاب لیے گزر جاتی تو گرتی بارش کی لڑیاں' کانچ کے ریزوں کے مانند چمک اٹھتیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ کھائی میں جھینگر' مینڈک اور پپیہے بول رہے تھے' چوک میں پہنچ کر ٹمپل روڈ کی طرف گھوم گیا' سڑک پر حسب معمول اندھیرا تھا۔ کہیں کہیں مکانوں اور تاڑی خانوں میں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ ایک جگہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیا گیا۔

”مرغی صاحب؟“

اور اس کے اچھا والا کہنے سے پیشتر ہی میں اس کے ساتھ ہولیا، جیسے سودا پہلے سے ہی طے تھا۔ اپنی طوری کامیابی پر وہ پستہ قد دلال اینٹھا اینٹھ کر میرے آگے چلنے لگا۔ کچھ دور چل کر ہم ایک تنگ گلی میں گھوم گئے۔ یہاں کچے ناریل اور سڑے بسے پیازوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دلال نے دھوتی میں اڑائی ہوئی تارچ جلائی اور اس کی کمزور روشنی میں مجھے ایک مکان میں لے گیا۔ مکان بالکل خالی ڈربہ معلوم ہو رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں واقعی مرغیاں خریدنے آیا ہوں۔ ایک کمرے میں پھیکی سی روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکیوں پر زرد رنگ کے پرانے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اس کمرہ میں چھوڑ کر چلا گیا۔ کمرہ اگرچہ چھوٹا تھا مگر سلیقے سے سجا ہوا تھا فرش پر ایک مٹیالی دری بچھی تھی اور قریب ہی پتائی پر کانسی کے تھال میں مہاتما بدھ کی سیاہ پتھر کی مورتی رکھی تھی جس کے قدموں میں کچھ سفید پھول مرجھا رہے تھے، فضا میں ایک مانوس قسم کی گھریلو کیفیت تھی۔ مجھے وہاں کی ہر شے پیاری اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ میں نے برساتی ایک طرف رکھ کر سگریٹ سلگایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ ابھی میرا سر دیوار سے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک دبلی پتلی لڑکی اندر داخل ہوئی اور مسکراتی ہوئی میرے قریب ہی پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی اس کے بال اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں کی مانند گہرے سیاہ تھے، جنہیں اکٹھا کر کے اس نے جوڑے کی شکل میں گردن پر باندھ رکھا تھا جوڑے میں ننھی ننھی زرد کلیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ اس کا رنگ مونگرہ، کلی ایسا زردی مائل سپید اور کومل تھا۔ وہ ہلکے عنابی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے آدھے ننگے بازو گول اور گداز تھے پیشانی پر سرخ بندی خون کا داغ معلوم ہو رہی تھی۔ میری نظروں میں ایکا ایکی وہ مقدس معبد پھر گئے جن کے نیم روشن تہہ خانوں میں کالی کالی آنکھوں والی دیوداسیاں، عود و عنبر کی نیلگوں، دھند میں والہانہ رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی روشن اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی اپنے آپ مسکرا رہا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اپنے ہمسائے بیرسٹر صاحب اور اس کی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔

”آپ ذرا کھل کر بیٹھ جائیں۔“ اس نے بڑ صاف انگریزی میں کہا۔ اس کی آواز نرم اور خواب آلود تھی۔

”تم انگریزی جانتی ہو؟“

”کیوں نہیں، ہمیں سیکھنا ہی پڑتی ہے، آپ تو جانتے ہیں، سیلون میں عیسائی زیادہ ہیں۔“

”ہاں ہاں ٹھیک ہے۔“

وہ ہنس پڑی اور اس کے گدرائے ہوئے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے۔ میں نے سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے دبانے لگا اور دیوداسی کی سیاہ آنکھوں میں پر نور اجالا جھلکنے لگا وہ جلدی سے اٹھ کر گوتم بدھ کی مورتی

کے پاس گئی اور کانسی کے تھال میں اپنے جوڑے کی زرد کلیاں رکھ کر واپس چلی آئی۔ اب اس کے لمبے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے' پلنگ پر لیٹ کر اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور اس کے سیاہ بال میرے بازوؤں پر بکھر گئے اور مجھے غالب کا مشہور شعر یاد آ گیا۔ میں نے ان بالوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھتے ہوئے پوچھا۔

’’تمہارا نام کیا ہے؟‘‘

وہ میرا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ہوئے خواب آلود آواز میں بولی ’’یشودھرا۔۔۔۔۔۔۔۔اور تمہارا نام؟‘‘

میں ان آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک گیا’’سدھارتھ۔‘‘

وہ چونک اٹھی’’سدھارتھ؟‘‘

’’ہاں!

’’یہ تو ہمارے مقدس بدھا کا نام تھا۔‘‘

’’ہاں!‘‘

’’اور یشودھرا اس کی بیوی تھی۔‘‘

ہاں!‘‘

’’کیا تم بدھی ہو؟‘‘

ہاں!‘‘

اور اس نے کسی پراسرار طاقت سے مغلوب ہو کر اپنے آبنوسی بازو میری گردن میں حمائل کر دیئے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا' مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر کسی آفاقی رقص میں ڈھلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا جیسے ملایا کی طرف سے آنے والی مشرقی ہواؤں کے مہربانی جھونکے مجھے ان مندروں میں اڑا لے گئے ہوں جن کے دھندلے تہہ خانوں میں نیم عریاں دیوداسیاں' بدھ کی کنواری بیٹیاں' گجرے پہنے عنبر و لوبان کی خوشبوؤں میں مقدس بدھا کے روبرو تھرک تھرک کر رقص کر رہی ہوں۔ دھیمی دھیمی روشنی میں ان کے لچکدار اعضاء دمک رہے ہوں۔ رقص' نغمے' گل صد برگ' موگرہ کلی' چمپا کلی' گومتی' انومندی' اور یشودھرا صندلیں' نیم عریاں کنوارے جسم اور سیاہ بالوں والی یشودھورا حسین سا کیہ شہزادی!

اور یشودھرا کا جسم کانپ رہا تھا لرز رہا تھا' کسے ہوئے تار کی طرح' جسے زور سے جھنجھنا دیا گیا ہو۔

یشودھرا نے دراز پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا' ان آنکھوں میں دن کا اجالا' شفق کا زریں سونا پگھل رہا تھا' صبح ہو رہی تھی شام ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر بن مو سے شیریں مہک کی لہریں امڈ رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں میں شراب اور پسینے کے کسیلے ذائقے کی بجائے' سنگلدیپ کے جزیرے کے جنگلی شہد ایسی مٹھاس تھی۔ اس کے گداز جسم کی ریشمی سطح پر ایک کنواری اور لذیذ تھرتھراہٹ تھی جیسے وہ اپنی دوشیزگی کا سرمایہ پہلی بار کسی کو سونپ رہی ہو۔

یہ ایک شرمیلی دلہن کا اچھوتا اور بے داغ جسم تھا۔

اس میں نرل خون کی حدت اور پاکیزگی تھی۔

''تم سدھارتھ ہو اور میں یشودھرا ہوں۔ ساکیہ شہزادی' میں تمہاری بیوی ہوں میرے جسم کی سیج پر تم زندگی کے آخری لمحات تک آرام کر سکتے ہو۔ اس سیج کے پھول تمہارے انتظار میں سوکھ رہے تھے تم کہاں تھے؟ کدھر تھے؟''

یشودھرا جیسے خواب میں بول رہی تھی اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں' اس کے بازوؤں کی گرفت میری گردن میں زیادہ مضبوط ہو رہی تھیں' مجھے ایک طرح کا خوف سا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں کوئی شرمیلی دلہن ہوں اور کسی اکھڑ مرد کا کھردرا ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہے۔

''میرے دل پر ہاتھ رکھ دو میرے شہزادے! مجھے اپنے سینے سے لگا لو تا کہ میری سانس تمہاری سانس میں ڈوب جائے اور میرا دل' تمہارے دل کی تال پر دھڑکنے لگے اور قریب آ جاؤ ساکیہ میری ساتھ لگ جاؤ' آج میں تمہیں ان سرحدوں تک لے جاؤں گی جہاں پہنچ کر عورت کی مملکت ختم ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ رہنا میرے سدھارتھ! ہم زمین کی نچلی تہوں میں اتر رہے ہیں۔ نیچے' نیچے اور نیچے' یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کو بیٹھے گی اور گرم سے گرم تر ہوتی جائے گی' ہم ایک انجانے خلا میں پہنچ جائیں گے۔ غیر مرئی' نورانی ان دکھا انوکھا نیم روشن' نیم تاریک' جہاں بے شمار چاند ستارے چکر لگا رہے ہوں گے اور ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے' سینہ بہ سینہ بڑھتے ہی چلے جائیں گے آگے ہی آگے۔

یشودھرا کی آواز بتدریج کسی تاریک غار میں ڈوب گئی' اور ہماری سانس ایک دوسرے سے مل گئی اور ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑکنے لگے۔ زمین کی تہیں ہمارے قدموں تلے سرکتی چلی گئیں اور ہم نیم روشن' نیم تاریک' گہرائیوں میں اترتے چلے گئے' نیچے' نیچے اور نیچے یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھی' وہ گرم سے گرم تر ہوتی چلی گئی اور پھر۔

پھر جب ہمارے دل اپنی اپنی تال پر دھڑکنے لگے اور ہم ایک بار پھر زمین کو اصلی سطح پر آ گئے تو میں نے برساتی کا ندھے پر رکھی

بال درست کیے، سگریٹ سلگایا اور بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی، اپنی رات بھر کی بیوی، ساکیہ شہزادی کو جھک کر دیکھنے لگا، بجلی کی پھیکی سی روشنی میں اس کا چور چور جسم یوں نڈھال پڑا تھا جیسے یکے بعد دیگرے اس نے کئی بچوں کونم دیا ہو اس کی آنکھیں بند تھیں اور پیشانی پر سرخ بندی کا خون پسینے میں گھل مل رہا تھا، ہونٹ ذرا سے کھلے تھے اور ہموار دانتوں کی سپید لکیر چمک رہی تھی، تنفس کے ساتھ اس کا سینہ آہستہ آہستہ ڈوب ابھر رہا تھا، سیال لانبے بال گول گول مدر چھاتیوں کی مخملیں ڈھلوانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

یہ صندل کے سایوں میں چھپے ہوئے بدھی مندروں کے دودھیا گنبد، یہ آندھر دیش کے نیلے نیلے تالوں میں کھلنے والے کنول کے پھول انہی گنبدوں کے مقدس سایوں میں بیٹھ کر کالی داس نے شکنتلا لکھی تھی اور یہی وہ کنول کے پھول تھے جن کی کول پتیوں پر شکنتلا نے راجہ دھنشت کو اپنا پریم سندیسہ لکھ کر بھیجا تھا۔

یہ متعفن اور کچلا ہوا غلیظ جسم نہیں تھا۔ یہ ٹمپل روڈ کی بازار عورت نہیں تھی۔

یہ مجورا، رامیشور اور ملایا کی معبدوں کی سیڑھیوں، پر عظیم ستونوں کے سایوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی دوشیزہ تھی یہ مس ایملی، گلیٹی اور فیلس ڈکنز نہیں تھی یہ سیتا تھی۔ رام کی سیتا۔ جسے بھوک، غریبی اور افلاس کا راون اس کے وطن سے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا اور جسے کسی رام پرچھمن کا انتظار تھا۔

یہ یشودھرا تھی ساکیہ شہزادی جس نے جنوبی ہند کے نیلے پانیوں کے جھاگ سے جنم لیا تھا۔

یہ سنگدلیپ کی افراڈویٹی تھی۔ یہ لنکا کی لاڈلی تھی۔

یہ مچھلی مارکیٹ نہ تھی، پھول مارکیٹ تھی، لوگ اس کے قریب سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہ پاؤنڈز کی نقلی مہک نہ تھی بلکہ جنگلی پھولوں کی قدرتی خوشبو تھی یہ دھوپ میں چمکنے والا سنہری کلس تھا۔

یہ لنکا تھی زندہ لنکا سیتا کی لنکا سونے کی لنکا۔

میں نے سونے کی لنکا پر الوداعی نظر ڈالی، جیسے شہزادہ سدھارتھ، رتناگری کے مہیب جنگلوں میں نکل جانے سے پیشتر، اپنی بیوی یشودھرا کو آخری بار دیکھ رہا ہو اور باہر نکل آیا باہر چوک والی خانقاہ میں پچھلے پہر کا گجر بج رہا تھا اور اس کے چمکیلے کلس کے اوپر ایک بڑا سا نیلا ستارہ، پھولتی سحر کی کافوری جھلکیوں میں ماند پڑ رہا تھا۔

میں یوں مطمئن اور پرسکون تھا، جیسے میں سچ مچ گوتم بدھ ہوں اور مجھے ابھی گیان حاصل ہوا ہے۔

◆ ◆ ◆

گولڈ فلیک اور بیٹری

کوٹھڑی کا دروازہ بند کرتے ہی کھانسی نے اس پر حملہ کر دیا۔

اور وہ پھر اندھیرے میں دیوار کا سہارا لیے جھک کر کھانسنے لگا۔ صبح ہی سے اس کے سینے میں درد کی لہریں سی اٹھنے لگی تھیں اور کوئی پراسرار آواز سرگوشی میں اس کے کانوں کے قریب کسی خوفناک شے کا نام دہرانے لگی تھی۔

جنوری کی چمکیلی اور پرسکوں دھوپ میں ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے یہ درد ایکا ایکی ایک ٹیس بن کر اس کے سینے میں اٹھا تھا اور اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔ کسی نو گرفتار پرندے کی مانند یہ درد بار بار اپنا سر اس کے کمزور پسلیوں سے ٹکرانے لگا اور وہ سینہ تھام کر وہیں دہرا ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد جب درد میں کچھ کمی ہوئی تو وہ کھیتوں کی مینڈھ سے اٹھ کر علی بخش لوہار کی دوکان پر چلا گیا اور باہت تخت پر بیٹھا اس سے دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا ایک پرندہ بدستور اپنے پنجرے میں پھڑپھڑا رہا تھا۔ ایک بار پھر وہی ٹیس شعلے کی طرح لپکی اور تیز نیزے کی مانند اس کا سینہ چھیدتی ہوئی باہر نکل آئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار ایک مدھم سی چیخ نکل گئی اور علی بخش لوہار گھوڑے کی نعل کو بھٹی سے نکالتے رک گیا۔

"خیر تو ہے بابو؟"

خیر ہے چچا۔"

"بھئی سردی ہے سینہ لپیٹ کر رکھا کرو۔ تمہارا کمبل کیا ہوا؟"

وہیں بیٹھے بیٹھے لال لال سورج کا تھال اپنے پیچھے قرمزی شفق چھوڑ کر مغربی جانب شیشم اور آم کے گھنے ذخیروں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اور گاؤں کے کچے مکانوں سے اٹھتا ہوا مضمحل دھواں شام کی پھیکی اور بے رنگ اداسی میں تحلیل ہونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر وہ اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا جو گاؤں کے مشرقی حصہ میں پرانے تالاب کے پاس واقع تھی اور جہاں وہ تقریباً سات ماہ سے روپوشی کے دن گزار رہا تھا۔

پرانے تالاب کے پاس پہنچ کر اچانک کھانسی نے اسے آن دبوچا اور پیپل تلے ٹوٹے ہوئے چھکڑے پر بیٹھ گیا۔ کھانسی ایک خوفناک بھوت کی طرح اس کے سارے جسم کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ اس کے پٹھوں اور گردن کی تمام رگیں اکڑ کر تن گئی اور چہرہ پسینے میں تر بتر

ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ زمین پر تھوکتے ہوئے اس کی نظر سیاہ اور جمے ہوئے خون پر گئی اور اس کا بدن سر سے پیر تک سرد پڑ گیا۔ جیسے کسی برف آلود ہاتھ نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا ہو۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل کر بے نوری ہو گئیں۔

''انجام قریب ہے۔'' جیسے کسی نے ہولے سے اس کے کان میں کہا اور وہ سہم کر اکٹھا ہو گیا۔ وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا اور موت سامنے والی کوٹھڑی میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ چھکڑے کے بانس کا سہارا لے کر وہ اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے اپنی کوٹھڑی کی طرف چل پڑا۔ اب سردی اتر آئی تھی۔ تالاب میں شفق کا رنگ مٹیالا ہو رہا تھا اور آسمان پر تاروں کے فانوس روشن ہونے لگے تھے اور پرندوں کی ٹولیاں اپنے اپنے آشیانوں کی سمت چپ چاپ اڑی جا رہی تھیں۔

کوٹھڑی کا دروازہ کھولتے ہی اسے محسوس ہوا گویا وہ کسی گہرے اور تاریک غار کے منہ پر کھڑا ہے اور یہ غار اسے نگلنے کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

''انجام قریب ہے' انجام قریب ہے۔''

یہ خوفناک الفاظ سرگوشی کے انداز میں سنسان کوٹھڑی میں چمگادڑوں کی طرح غوطہ لگا رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور کھانسی نے ایک بار پھر اس پر حملہ کر دیا اور وہ دیوار کا سہارا لیے جھک کر کھانسنے لگا۔ جیسے کوئی طاقتور شے اس کے بدن کو دھنک رہی تھی اور اس کا رنگ انگ روئی کے لطیف گالوں کے روپ میں فضا میں منتشر ہو رہا تھا۔ تھوکتے وقت اس کے ہونٹوں پر کسیلا اور نمکین لعاب بہہ نکلا۔ اندر اگرچہ اندھیرا تھا مگر اسے یقین تھا کہ لعاب صرف خون ہے سیاہ اور جما ہوا خون۔

کھانسی رکی تو سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ اس کی ٹانگوں میں سے طاقت گویا زائل ہو گئی تھی۔ جیسے وہ اس کی اپنی ٹانگیں نہ ہوں' ایسے شخص کی ہوں جو کئی ماہ ہسپتال میں پڑے رہنے کے بعد پہلی بار بستر سے اٹھ رہا ہو۔ اس کا بند بند درد کرنے لگا تھا۔ اس نے جیب سے دیا سلائی نکال کر طاق میں رکھا ہوا دیا جلایا۔ اندر کمزور اور مدھم روشنی پھیل گئی اور مختصر سا معمولی سامان نظر آنے لگا۔ بند کھڑکی کی سل پر قلم دوات' شیو کا صابن' ٹوٹا ہوا شیشہ' بیڑیوں کا ایک بنڈل' چند ایک پھٹی پرانی کتابیں' رسالے' کونے میں ٹین کے سوٹ کیس پر گرد سے اٹے ہوئے جوتے اور اوپر دیوار سے لٹکتی ہوئی میلی شیروانی۔

دیا جلا کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور کمبل منہ پر کھینچ لیا۔ سینے کا درد اگرچہ کم ہو گیا تھا مگر اس کا بدن پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کمبل منہ پر کھینچتے ہی جیسے غار کا تاریک منہ زیادہ بھیانک صورت میں بدل کر اور آگے کھسک آیا۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں میچ لیں۔

"آ گئی، آ گئی، موت آ گئی۔"

چمگادڑیں فضا میں غوطے لگا رہی تھیں۔

وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے زندگی کے چھبیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ اس نے ابھی تک خزاں میں درختوں کی ٹہنیوں کو اپنے گلے سڑے سوکھے پتے پھینکتے ہی دیکھا تھا۔ ان ٹہنیوں پر بہار کے اولیں شگوفے کس طرح اپنی ننھی منی آنکھیں کھولتے ہیں اور کب ہری بھری نرم بیلوں کے اجلے پھول شرابی ہواؤں کی تال پر جھومنے لگتے ہیں؟ اسے کوئی خبر نہ تھی اس نے خزاں کا غمناک مرثیہ ہی سنا تھا۔ بہار کے مدھر الاپ سے اس کے کان ہنوز ناآشنا تھے۔ وہ بہار کا منتظر تھا۔ وہ کب سے بہار کا منتظر تھا اور بہار ابھی نہیں آئی تھی۔

کسان تحریک سے ناطہ جوڑنے سے پہلے وہ ایک آزاد اور کھلنڈرا لڑکا تھا۔ اس نے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں آنکھ کھالی تھی۔ وہ لمبے قد، مضبوط ہاتھ پاؤں چوڑے چکلے سینے گول گول چمکدار آنکھوں اور مضبوط دانتوں والا ایک ہنس مکھ جوان تھا۔ سخت محنت اور جفاکشی و مشکل پسندی کا خیال اسے نچلا نہ بیٹھنے دیتا۔ اپنے محلے کے ٹال پر کشمیری ہاتھو کو کلہاڑا چلاتے دیکھ کر اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتیں۔ کئی بار کلہاڑا تھما کر اس نے خود لکڑیاں پھاڑنا شروع کر دیں اور جلد ہی تھک ہار کر پسینے میں ڈوب گیا اور کسی بڑے سے مڈھ سے پیٹھ لگائے ٹانگیں ٹھنڈی ٹھنڈی زمین پر پسارے وہ لذیذ تھکن کے پر لطف اتار کا مزہ لینے لگا۔

دیہاتی فلموں یا تصویروں میں وہ کسانوں کو تہمد باندھے تیز دھوپ اور بارشوں میں کھیتوں میں فلائی کرتے، ہل چلاتے زمین کھودتے فصل کاٹتے دیکھتا تو اس کا چہرہ فرط مسرت سے سرخ ہو جاتا۔ رگوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی۔ وہ سوچتا کاش میں بھی کسان ہوتا اور کھیتوں میں کام کیا کرتا۔

اسے ابتدا ہی سے کسانوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی بے حد خواہش تھی۔ اس کا مزاج لڑکپن سے ہی دہقانہ تھا۔ ایک دن وہ چپکے سے آبادی سے باہر نکل گیا۔ تین چار میل طے کرنے کے بعد اسے کسان اور مزدور کھیتوں میں کام کرتے ملے۔ گیہوں کی فصل ابھی پوری طرح پکی نہیں تھی مگر ایک کھیت میں کٹائی شروع ہوئی گئی تھی۔ یہاں فصل تقریباً پک چکی تھی۔ وہ بھی ان میں شامل ہو گیا اور شام تک گیہوں کے پتلے پتلے خوشے کاٹ کر ان کے گٹھے بناتا رہا۔ پکے ہوئے اور ادھ پکے گیہوں کی سوندھی مہک نے اس کے بدن میں تازگی اور بشاشت کی لہر دوڑا دی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ طویل بیماری سے شفایاب ہوا ہو۔ شام کے وقت وہ خوش خوش گھر لوٹا۔ ارچہ اس کے ہاتھوں پر جگہ جگہ خراشیں آ گئی تھیں اور کئی جگہوں سے سرخ سرخ خون بہنے لگا تھا مگر اسے درد کا احساس تک نہ

تھا۔ اس رات وہ تھکے ہارے گھوڑے کی طرح سویا اور اس نے بھرپور نیند کا لطف اٹھایا۔

کالج میں آتے ہی وہ اپنے اکھڑ انداز گفتگو، مضبوط ڈیل ڈول اور دہقانوں ایسی چال ڈھال کی وجہ سے بہت جلد جیسی مشہور ہو گیا۔ وہ ہر بات کا ہنس کر جواب دیتا۔ اس کی ہنسی میں دودھ ایسی تازگی اور شبنم ایسی پاکیزگی تھی۔ ہنستے وقت اس کے مضبوط دانتوں کی سفید قطار پوری آب و تاب کے ساتھ چمک اٹھتی اور اس کی گول گول آنکھوں میں زندگی کی سچی خوشی کا نور جھلملانے لگتا۔ لڑکے بہت جلد اس سے مانوس ہو گئے اور اس کے گرد اکثر دوستوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ اس کے بلند اور طویل قہقہے صحت مند اور تسکین بخش تھے۔ یہ قہقہے ایک تیز رفتار پہاڑی نالے کی طرح اس کے دوستوں کے دلوں سے نفرت، غصہ اور غم کے جلے کٹے سرکنڈوں کو بہا کر لے جاتے اور انہی اپنے دل بچوں ایسے معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتے۔ ان قہقہوں میں زندگی امید اور روشنی کا بھرپور احساس تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کی ایک جماعت بنائی جو مہینے میں ایک بار قریبی دیہاتوں کے دورے پر نکل جاتی۔ گاؤں گاؤں جا کر وہ کسانوں سے ملتے۔ ان کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے۔ انہی پرانے ہلوں کی جگہ مشینی ہل خریدنے کی تلقین کرتے۔ گندی گندی گلیوں، کوٹھڑیوں اور ڈھور ڈنگر کی صفائی اور صحت کے بارے میں تقریریں کرتے۔ انہیں کہتے کہ وہ اپنے بچوں کو تھوڑی بہت تعلیم دلائیں اور تعلیم دلوانے کے بعد انہیں شہر کے دفتروں میں کلرک بھرتی کروانے کی جگہ ان سے کھیتی باڑی کا کام لیں۔ بعض کسان ان کی باتوں پر اثبات میں سر ہلاتے اور بعض بڑے بوڑھے کسان ان کی سنی ان سنی کر دیتے۔

چار سال کی مسلسل پڑھائی اور دیہاتی دوروں کے بعد ایک روز اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ کسان جن کی منڈلی میں شامل ہو کر اس نے پہلی بار فصل کی کٹائی کی تھی اور جن کے درمیان وہ مدت سے ترقی اور اصلاح کا پرچار کر رہا تھا اصل میں حقیقی خوشی اور سچی خوشحالی سے کوسوں دور ہیں۔ اس نے دوسرے ملکوں کے کسانوں سے اپنے دہقانوں کا مقابلہ کیا تو اسے یہاں محسوس ہوا گویا وہ پیرس کے خوشنما بازاروں میں سے گدھے پر سوار ہر گزر رہا ہو۔

شہروں کی عالیشان عمارتوں، سنگین ہوٹلوں، شاداب پارکوں اور کلبوں میں رہنے والے مہذب انسان نے اپنے اس دیرینہ ساتھی، دور افتادہ بھائی کو بالکل بھلا دیا تھا جو گمنامی، تنگ دستی اور جہالت میں گھرا ہوا، سردیوں کی سنسناتی راتوں میں گھٹنوں تک پانی میں ڈوبا ان کے لیے راشن کا بندوبست کر رہا تھا کیک بنا رہا تھا، سینڈوچ بنا رہا تھا، پیسٹری پیٹیز اور کورن فلیکس کے بیج بو رہا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی زندگی ان دور افتادہ بھائیوں کی فلاح کے لیے وقف کر دے گا کالج میں آخری سال گزار چکنے کے بعد جب اس نے اپنے باپ کو فیصلے سے آگاہ کیا تو ان کی ترکی ٹوپی کا سیاہ پھندنا ایک دم ساکن

ہوگیا۔ انہوں نے عینک کے پیچھے سے بیٹے کو گھورا۔ وہ اسے جاہل اور اجڈ کسانوں کے درمیان بیٹھے بیوقوفوں کی طرح باتیں کرتے اور ایک احمقانہ مقصد کی خاطر گاؤں کی خاک چھانتے دیکھنے کی بجائے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ اس کثیر رقم کو اس طرح دیہاتی علاقوں کی دھول میں ملتے نہ دیکھ سکتے تھے جو انہوں نے اپنے بیٹے پر خرچ کی تھی۔ انہوں نے اسے ہر ممکن طریقے سے سمجھانے اور بے معنی ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر ان کا بیٹا اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ اسے چچا زاد بہن طاہرہ کا لالچ دیا گیا جو بی۔ اے میں پڑھ رہی تھی اور امیر ماں باپ کی بیٹی ہونے کی علاوہ خوبصورت بھی تھی مگر یہ وار بھی خالی ہوگیا۔ اسے آخری بار کہا گیا اگر اس نے ضد نہ چھوڑی تو اسے گھر چھوڑنا پڑے گا۔

چنانچہ ایک روز وہ چند کتابیں اور کچھ کپڑے سوٹ کیس میں ڈال کر گھر سے نکل پڑا اور اپنے ایک دوست کے ہاں ٹک گیا۔ اس نے وقت ضائع کیے بغیر رسالوں اور اخبارات میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مگر ان مضامین کا معاوضہ اتنا قلیل اور اتنی دیر سے ملتا تھا کہ وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت پر مجبور ہوگیا۔ سیاسی ماحول میں براہ راست داخل ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس کا تعلق ایک ایسی جماعت سے ہوگیا جو کسانوں کی بہتری کے لیے کام کر رہی تھی۔ اس نے اپنی تنخواہ کا آدھا حصہ اس جماعت کے نام وقف کر دیا۔ یوں ہر ماہ اس کے پاس ساٹھ روپے بچے تھے۔ اس نے اپنی ضروریات کو بتدریج کم کرنا شروع کر دیا۔ سلکی قمیضوں کی جگہ، ہتھ کھڈیوں کے بنے ہوئے کھدر کے کرتوں اور پاجاموں نے لے لی۔ اس سے پیشتر وہ گولڈ فلیک کے علاوہ کوئی سگریٹ نہیں پیتا تھا مگر اب تارہ مارکہ بیڑیوں کا بنڈل اس کی جیب میں رہنے لگا۔ کبھی کبھار سینما جاتا تو ہمیشہ تیسرے درجے کا ٹکٹ خریدتا۔ وہ صبح سویرے اٹھتا۔ خالی پیٹ میں دفتر چل پڑتا۔ وہاں ایک گھٹیا قسم کے قہوہ خانے میں چائے کا ایک پیالہ پیتا۔ دوپہر کو وہیں روکھی سوکھی روٹی کھا لیتا اور شام کو کام ختم کرنے کے بعد کسان کمیٹی کے دفتر پہنچ جاتا۔ رات کو تھکا ہارا گھر لوٹتا۔ دو گھنٹے تک کتابوں اور مختلف ملکی اور غیر ملکی رسالوں کا مطالعہ کرتا اور پھر بے سدھ ہو کر سو جاتا۔

زندگی کے بوجھ کو براہ راست اپنے کندھوں پر اٹھا چکنے کے بعد اسے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ کسی وقت جب وہ اپنے کرتے یا پاجامے کو پھٹی ہوئی جگہ سے مرمت کرنے لگتا تو بے اختیار اسے اپنا گھر اپنی ماں اور بہنیں یاد آ جاتیں اور وہ ہلکی سی آہ بھر کر زیر لب ہنس دیتا۔ جیسے رات اس نے کوئی سہانا اور جگمگاتا ہوا خواب دیکھا ہو۔

اپنے گھر، ماں باپ، بہن بھائیوں کو چھوڑے اسے تقریباً ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران میں ایک آدھ دفعہ اس نے اپنے باپ کو تانگے میں بیٹھے گزرتے دیکھا اور اس کے دل میں محبت، احترام اور غم کا ملا جلا احساس جاگ اٹھا۔ وہ سوچتا کہ اس نے ایک

گھر سے نکل ہر ہر گھر کو اپنایا ہے۔ گنتی کے افراد کی ذاتی مسرتوں کا گلا گھونٹ کر وہ دنیا جہان کے پسماندہ' مفلس اور بدنصیب لوگوں کی لٹی ہوئی' چھنی ہوئی' گمشدہ خوشیوں کی ٹوہ میں نکلا ہے۔ انفرادیت کے سرد اور تاریک غاروں سے نکل کر ہمہ گیر انسانیت اور محبت کے کھلے اور وسیع میدانوں میں آ گیا ہے۔ خاموش اور سنسان چوٹیوں سے اتر کو وہ ان دلدلی کھڈوں میں چل پھر رہا ہے جہاں ویران سر کنڈوں کے خاردار جال میں الجھے ہوئے مہیب پتھروں تلے دبے ہوئے بے حس اور بے جان انسان ہر قدم پر اس کے بے لوث ہمدردیوں اور قربانیوں کے محتاج ہیں۔ اپنے گھر میں رہ کر وہ سوائے اپنے ماں باپ اور طاہرہ کو خوش رکھنے کے اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن گھر سے باہر نکل کر وہ ماں' ہر یا اور ہر طارہ کو اپنے ساتھ لیے ازلی اور ابدی مسرتوں کے ان چشموں کی طرف جا رہا ہے جو زندگی اور انسانیت کی شاداب وادیوں میں سرد و صنوبر کے جھنڈوں میں بہہ رہے تھے۔ شاید وہ سفر میں ہی کہیں دم توڑ دے۔ شاید اس کے پیاسے ہونٹوں کو ان چشموں کا سرد اور شیریں لمس نصیب نہ ہو۔ لیکن اگر انسان اس کے بعد بھی ان راہوں پر چلتے رہے تو ایک نہ ایک دن وہ ان چشموں پر ضرور پہنچ جائیں گے۔ ان کے سوکھے ہوئے پیاسے ہونٹ سرد اور شیریں پانی کی شاداب سطح کو بے اختیار ہو کر چوم لیں گے اور ان کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی سی چمک پھر عود کر آئے گی اور انہی وادیوں میں صنوبر کے جھنڈوں تلے ابلتے ہوئے شفاف چشموں کے کنارے انہیں وہ پر ملیں گے جنہیں ان کے بازوؤں سے جدا کر کے وہاں پھینک دیا گیا تھا۔ اور گلہ بان انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے تاریک کھڈوں کے دلدلوں میں اتر گئے تھے۔

شہر کی گندی اور تاریک گلیوں میں کھیلتے ہوئے نیم عریاں بچوں کی منڈلیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے ہر بچے پر اپنا بھائی اپنا بیٹا ہونے کا گمان ہوتا راشن ڈپوؤں کے آگے خالی کنستر' تھیلے اور برتن زمین پر رکھے قطار در قطار کھڑے آدمیوں' عورتوں اور بچوں کو دیکھ کر اسے محسوس ہوتا کہ وہ اس کے اپنے کنبے کے افراد ہیں۔ جنہیں اس بھوکے ننگے دور کے مہذب انسان نے دانے دانے کا محتاج کر رکھا ہے۔ جو راشن ڈپوؤں میں اناج کے انباروں کے باوجود گمنامی اور اندھیرے میں فاقوں پر فاقے کر رہے تھے۔ جن کے بچے خالی پیٹ بغل میں بستہ داب کر سکول پڑھنے جاتے تھے اور جن کے گھروں میں راشن کارڈ تو ہے مگر راشن نہیں۔ لکڑیاں ہیں مگر چولہے ٹھنڈے ہیں۔ زندگی ہے مگر خود زندہ نہیں۔ جو وقت سے پہلے ختم ہو رہے ہیں' جو موت سے پہلے مر رہے ہیں شہر سے باہر بالکل نکل کر اس کی نگاہیں لمبی لمبی چمنیوں والے ان کارخانوں کی طرف اٹھ جاتیں جہاں جنگی سامان دھڑا دھڑ تیار ہو رہا تھا اور جو دن رات نفرت' دھواں' راکھ اور موت اگل رہے تھے۔

یہ کارخانے آدمیوں کے علاوہ اناج بھی کھاتے ہیں۔ یہ آدم خور نہیں اناج خور بھی ہیں۔ انسانوں کو ان کارخانوں کی اتنی ضرورت

نہیں جتنی ہری بھری لہلہاتی اور زرخیز زمین کی ہے۔ یہ جنگ' قحط' بھوک اور غلامی کو جنم دیتے ہیں لیکن زمین امن' خوشحالی اور آزادی کا پیغام دیتی ہے۔

ہم اسے انسانی کھوپڑیاں اور گندگی دیتے ہیں اور وہ ہمیں گیہوں کی خوشبودار بالیاں اور میٹھے رنگ دار پھل اور سرد چشمے عطا کرتی ہے۔ دھرتی نے ہمیشہ اپنے بچوں سے محبت کی ہے اور انہیں نیکی' سچائی اور محبت کا سبق دیا ہے۔ اس کا کوئی راشن ڈپو نہیں کوئی راشن کارڈ نہیں مٹھی بھر انسانوں نے ساری دھرتی کو آپس میں بانٹ لیا ہے اور لوگوں کے گھروں میں چولہے ٹھنڈے پڑ گئے ہیں' کنستر گیہوں سے خالی ہو گئے ہیں' اور ان کے بچے خالی پیٹ سکول جانے لگے ہیں۔

وہ زمین کو ان مٹھی بھر ڈاکوؤں کے جنگل سے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ وہ ہر گھر میں شام کے وقت چولھوں کو گرم دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہر خالی کنستر کو گیہوں سے بھر دینا چاہتا تھا اور ہر کمسن کو اسکول روانہ ہونے سے پہلے دودھ پلانا چاہتا تھا۔ وہ پژمردہ چہروں اور بجھی بجھی آنکھوں والے بھوکے ننگے' بھولے بھٹکے انسانوں کو شہروں کی سنگین سڑکوں' تنگ و تاریک گلیوں اور بدبودار گھٹی گھٹی کوٹھریوں سے نکال کر قیمتی بیج کی طرح حد نگاہ تک پھیلے ہوئے زرخیز کھیتوں اور شاداب مرغزاروں میں بکھیر دینا چاہتا تھا۔ وہ ان کی مدقوق زندگیوں پر تندرستی اور خوشحالی کی آخری مہر ثبت کرنا چاہتا تھا۔

وہ چاہتا تھا لوگ آپس میں گرمجوشی سے ملیں اور خندہ پیشانی سے جدا ہوں۔ ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کریں اور زندگی کی دوڑ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ اطمینان اور سکون کے ساتھ سوئیں اور طلوع آفتاب کے ساتھ مسکراتے ہوئے' تازہ دم بستر سے اٹھیں وہ اس شے کو مہنگے سے مہنگے داموں پر اٹھانے کو راضی تھا۔ وہ اس سودے میں بڑے سے بڑا گھاٹا کھانے پر بھی تیار تھا۔

خود بیڑیاں پی کر' کھدر پہن کر' روکھی سوکھی روٹی کھا کر وہ دن رات کی محنت سے ایک ایسے باغ کی آبیاری میں منہمک تھا جس کی سایہ دار روشوں' نرم نرم گھاس کے خطوں' پھولوں بھرے تختوں اور پھلدار درختوں کی خوشبودار اور پرسکون چھاؤں میں ٹہلنے والے انسان کو بہترین سگریٹ' بہترین' خوراج اور اعلیٰ ترین خیالات نصیب ہو سکیں۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنے ماں باپ کی چھوٹی چھوٹی غیر اہم مسرتوں کو قربان کر سکتا تھا' اپنے بھائی کی محبت ہار سکتا تھا' طاہرہ کے حسین جسم اور خوبصورت آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ سکتا تھا اور ضرورت پڑنے پر اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو سکتا تھا۔ مگر ان لوگوں کو اکیلا اور بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا جن کا عمر بھر ساتھ دینے کی وہ قسم کھا چکا تھا۔

اسے خبر ملی کہ طاہرہ کی شادی اس کے بڑے بھائی سے ہو گئی ہے۔ ایک روز شام سے کچھ پہلے اس نے اس شہر کے بڑے باغ

میں طاہرہ کو ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی پہنے' بالوں میں چنبے کی سپید کلیاں اڑائے اپنے خاوند کے ساتھ ٹہلتے دیکھا۔ اس کا بھائی گولڈ فلیک سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے طاہرہ سے گفتگو کرتا جا رہا تھا۔

وہ بیڑی دانتوں تلے دبائے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں دیئے ایک طرف درخت سے ٹیک لگا کر انہیں دیکھتا رہا۔ سڑک کے موڑ پر جا کر وہ کلب کی طرف گھوم گئے۔ وہ زیر لب ہنسا اور واپس چل پڑا۔

وہ سوچنے لگا۔ اس کا بھائی گلڈ فلیک کا دھواں اڑاتے بہترین سوٹ میں ملبوس ایک ایسی سڑک پر چل رہا ہے جو آگے چل کر ایک ویران اور تاریک غار میں تبدیل ہو گئی ہے۔ وہاں وہ سوائے اپنے آپ کے اور کسی انسان کو نہیں پائے گا۔ اس غار میں چاروں طرف بڑے بڑے آئینے آویزاں ہوں گے اور اسے ہر طرف اپنا ہی عکس نظر آئے گا۔

لیکن جس سرک پر پھٹا ہوا لمبا کوٹ پہنے' بیڑی منہ میں دبائے چلا جا رہا تھا اگرچہ ویران اجڑی اجڑی اور تنہا تھی مگر اپنے اختتام پر ایک وسیع و عریض میدان میں نکل گئی تھی جہاں محبت کیے ہو کے اور مہربانی نظروں کے پیاسے' بے بس' بدنصیب مصیبت زدہ انسانوں کا ہجوم اس کے خلوص اور پیار کے میٹھے بول کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کا بھائی اپنے ارد گرد ریشمی تاروں کا جال بن رہا تھا۔ اس کی زندگی ریشم کے کیڑے کی زندگی تھی مگر وہ برگد کا پھیلی ہوئی گنجان شاخوں والا درخت تھا جو تھکے ہارے پردیسی مسافروں کو اپنی ٹھنڈی چھاؤں دیتا ہے اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے انسان کو اپنی ٹہنیوں کا ایندھن۔

اس کا دل میٹھے پھلوں سے لدا ہوا پودا تھا اور وہ اپنے پھل دونوں ہاتھوں سے لوگوں میں تقسیم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ چھپکلی کی مانند چھت کو بوسیدہ کڑیوں میں چھپے رہنے کی بجائے جگمگاتے ہوئے درخشاں سورج کی طرح پہاڑ کی چوٹی سے نور کا سیلاب لیے طلوع ہونا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کی روشنی میں بھولے بسرے پردیسی اپنی راہ پہچان کر اپنے دیس میں سکیں' کھیتوں میں اگی ہوئی فصل پک سکے اور خوشوں کی سیپ گیہوں کے موتیوں سے بھر سکیں۔

اس کے دل میں طاہرہ کے لیے بڑی جگہ تھی۔ اسے اس کا بیضوی چہرہ ذہین آنکھوں کی پراسرار چمک' لوچدار جسم اور والہانہ انداز گفتگو بڑا پسند تھا مگر وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔

زندگی کو محض ایک لڑکی کی محبت کے لیے وقف نہیں کر سکتا تھا۔ گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس نے ایک خواب دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا وہ جیل کی تاریک کوٹھری میں قید ہے۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں وہ سردی سے

ٹھٹھر رہا ہے اور اس کے اوپر سوائے ایک پتلے سے گندے کمبل کے اور کچھ بھی نہیں اور اس کی طاہرہ اس کی بیوی گھر میں بیمار بچے کو چھاتی سے لگائے بیٹھی ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کی ذہین چمک ماند پڑ گئی ہے۔ اس کے شبنمی ہونٹوں کا شہد سوکھ گیا ہے اور گدرائی ہوئی نازک کلائیوں کی رگیں کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے ابھر آئی ہیں وہ اس منظر سے سہم گیا۔

پھر اس نے ایک اور تصویر دیکھی۔ طاہرہ عروسی جوڑا زیب تن کیے دلہن بنی بیٹھی ہے۔ اس کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے۔ اس کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں اور باریک ہونٹ شدت غم سے قدرے اندر کو بھینچے ہوئے ہیں اور اس کی سہیلیاں اس کے پاس بیٹھی ڈھولک پر سہاگ گیت گا رہی ہے۔

آیانی لاڑیئے تیرا سہریاں والا---------

اور اس کا سہرے والا بارات لیے دروازے پر پہنچ گیا ہے اور طاہرہ کی کانپتی ہوئی پلکوں پر آنسوؤں کی موتی لرز رہے ہیں سہیلیاں اسے سہارا دیئے دھیرے دھیرے ڈولی کی طرف لیے جا رہی ہیں۔ طاہرہ کے قدم رک رک کر اٹھ رہے ہیں۔ جیسے وہ اندھیرے میں چل رہی ہو۔ جیسے اسے ہر قدم پر کسی کھڈ میں گر جانے کا احتمال ہو اور پھر ایک دم روشنیاں بجھ گئیں تاریکی چھا گئی' طاہرہ کے قدم لڑکھڑائے اور اس کی چیخ کھڈ میں دیر تک گونجتی رہی۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا' وہ دن بھر پریشان رہا تھا۔ مگر اس نے خواب کا دوسرا منظر اپنے لیے پسند کر لیا اور وہ گھر سے نکل پڑا۔ اور طاہرہ کھڈ میں گر پڑی۔ ایک عرصہ بعد شہر کے باغ میں طاہرہ کو ہنسی خوشی اپنے خاوند کے ساتھ ٹہلتے دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہوئی کہ طاہرہ کھڈ میں نہیں گری تھی۔

وہ بھی یہی چاہتا تھا۔ اب وہ پوری توجہ سے کام کر سکے گا۔ اس نے سوچا کام' کام کام ہر وقت کام دن رات کام۔

اور بھوک' بھوک' بھوک دن رات بھوک' طرح طرح کی بھوک دبی ہوئی پسی ہوئی گھٹی ہوئی اس کی صحت خراب رہنے لگی۔ ایک روز شیو بناتے وقت اس نے کنپٹیوں پر بیک وقت دو تین سپید بال دیکھے۔ اسے پہلی بار اس بات کا زندہ ثبوت ملا کہ وہ کام کر رہا تھا یہ کام کی زیادتی ہی نہیں بھوک کی زیادتی بھی تھی۔ اس نے انے اکھیڑے کی بجائے بالوں کو وہیں رہنے دیا۔

برسات شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے جبکہ کھیتوں میں دھان کی پنیری بونے کا موسم تھا' ملک کے شمالی دیہات میں کسانوں نے جاگیرداری ختم کرنے کے لیے عام بغاوت کر دی۔ کسان کمیٹی کے دفتر میں چھاپہ پڑا۔ چند ایک کارکنوں کے ساتھ اسے بھی گرفتار کر لیا گیا اور بغیر کسی قسم کا مقدمہ چلائے اسے دو سال کے لیے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

شروع شروع میں اسے جس کوٹھڑی میں بند رکھا گیا وہ نو فٹ چوڑی اور بارہ فٹ لمبی تھی۔ اسے پیشاب وغیرہ بھی اسی کوٹھڑی میں کرنا پڑتا تھا۔ اسے پڑھنے لکھنے کی سخت ممانعت تھی۔ یہ جگہ سرد مرطوب اور بے حد غلیظ تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا روشندان تھا جو چوڑی دیوار میں' چھت کے بالکل قریب اندر کو دھنسا ہوا تھا۔ یہاں سے ہلکی ہلکی روشنی کوٹھڑی میں مدھم غبار کی طرح پھیلتی رہتی۔ دن بھر وہ چارپائی پر پہلو بدلتا رہتا۔ رات کو گرمی اور حبس ہو جاتا اور مچھر اس کا گوشت توڑتے رہتے۔ پیشاب وغیرہ کی بدبو سے اس کا دماغ پھٹتا رہتا۔ کوئی اس کی کوٹھڑی کے قریب سے ہو کر بھی نہیں گزرتا تھا۔ ڈیڑھ ماہ اس قبر سے بھی بدتر کوٹھڑی میں لیٹ کر کروٹیں بدل بدل کر' ٹہل ٹہل کر' گزار چکنے کے بعد اسے ایک دوسری کوٹھڑی میں پہنچا دیا گیا جو کافی کھلی اور روشن تھی اور جہاں پیشاب وغیرہ کا بھی الگ بندوبست تھا۔ یہاں وہ پڑھ لکھ بھی سکتا تھا۔

ایک رات اچانک اسے بخار ہو گیا۔ دو دن تک وہ بخار بھی نیم ہوش پڑا رہا۔ تیسرے روز اس کا ڈاکٹری معائنہ ہوا اور اسے دوائی دی گئی مگر بخار نہ ٹلا۔ ڈیڑھ ہفتہ اسی حالت میں گزر جانے پر اسے ہسپتال وارڈ میں بھیج دیا گیا۔ ہسپتال پہنچ کر اگرچہ بخار دن بھر کے لیے دفعہ ہو جاتا مگر شام ہوتے ہی اس کا بدن گرم ہونا شروع ہو جاتا اور رات بھر وہ بخار میں بیہوش پڑا رہتا۔ بخار کے علاوہ اب ہلکی ہلکی کھانسی بھی شروع ہو گئی۔ یہ حالت چھ ماہ تک رہی اور اس کا بدن پہلے سے بہت لاغر ہو گیا۔ رنگ پیلا گیا اور آنکھوں کے گرد حلقے ظاہر ہو گئے۔ اس کا ایک رے لیا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہا اس کے پھیپھڑے کمزور ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اس کے لیے روزانہ ڈیڑھ پاؤ دودھ کی سفارش کی۔ تین دن تک اسے باقاعدہ صبح کو دودھ ملتا رہا۔ مگر چوتھے روز وہ پتلا ہو گیا۔ اب اس میں دودھ کم اور پانی زیادہ ہونے لگا۔ اس نے ڈاکٹروں سے شکایت کی لیکن دودھ سے پانی جدا نہ ہو سکا بلکہ اور بڑھ گیا۔ آٹے میں ریت اور کنکریاں بدستور موجود رہیں۔

پورے دو سال قید بھگتنے کے بعد جب وہ جیل سے رہا ہو کر اپنے دوستوں سے ملا تو وہ اسے بمشکل پہچان سکے۔ اس کے خدوخال بدصورتی کی حد تک بدل گئے تھے۔ وہ دبلا پتلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی صحت کافی حد تک گر چکی تھی اور روز بروز گر رہی تھی۔ کسی وقت اسے اپنے آپ پر ایسے مجرم کا گمان ہوتا جسے موت کی سزا دی گئی ہو اور جس کے لیے اپیل کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ وہ صحت اور تندرسی کا خواہش مند تھا کیونکہ وہ کام کرنا چاہتا تھا۔ وہ وقت سے بہت پہلے کسی بھی صورت میں موت کا استقبال کرنے کو تیار نہیں تھا۔ تاہم اس نے جی نہ ہارا وہ برابر کام کرتا رہا اور اس کے سر میں جگہ جگہ سپید سپیدہ بادل رو پہلی تاروں کی طرح چمکنے لگے رات کو بلاناغہ اسے کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ گالوں کی ہڈیاں باہر نکل آئیں آنکھیں اندر کو دھنس گئیں اور سیاہ حلقے زیادہ گہرے ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے

اسے پہاڑ پر چلے جانے کا مشورہ دیا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا وہ کسی پیر فقیر کر مرید ہے اور اسے دنیا تیاگ کر پہاڑوں پر نکل جانے کو کہا جا رہا ہے پہاڑوں پر کیا ہوتا ہے؟'' سردی اور پتھر!

کھانسی ایک گولہ سا بن کر اس کے پھیپھڑوں سے اٹھتی۔ یہ گولہ ہر جھٹکے کے ساتھ اس کی پسلیوں سے ٹکراتا۔ پھر یہ پھیلنے لگتا اور اس کا دم پھول جاتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی شے اس کے سینے میں پھٹنے کو ہو اور اگر وہ پھٹ گئی تو اس کے جسم کے پرزے اڑ جائیں گے۔ وہ نڈھال ہو کر چارپائی پر گر پڑتا اور ہانپنے لگتا اور اسے طرح طرح کے تکلیف دہ کمزور اور غیر صحت مندانہ خیال گھیر لیتے۔ وہ سوچتا۔ وہ ایک بیوپاری ہے جس کا سارا مال گلا سڑا اور شکستہ صورت میں بوریوں سے نکلا ہے۔ اسے عظیم ترین خسارے کا احساس ہوتا۔ اس نے زندگی میں کوئی بھی ایسا لافانی کارنامہ سرانجام نہیں دیا جس کے بدلے میں اس سے تندرستی ایسی انمول شے چھین لی گئی تھی۔ اس کا دل جو کبھی شیریں میووں سے لدا ہوا پودا تھا سوکھ کر مرجھانے لگا تھا۔ وہ سورج جو کبھی پہاڑ کی چوٹی پر بڑی آب وتاب سے طلوع ہوا تھا ان نچان کی بستیوں اور مرغزاروں پر شام کی اداس تاریکیوں کے ماتمی آنچل پھیلائے مغربی افق میں غروب ہو رہا تھا۔

کسی وقت وہ جھنجلا کر ایسے ناتواں اور بیمار خیالات کو دھکے دے کر نکال دیتا۔ جیسے وہ دیوانے ہوں جو پاگل خانے کی سلاخیں توڑ کر اس کے کمرے میں گھس آئے ہوں۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے اندر سے کنڈی چڑھا لیتا۔ لیکن یہ دیوانے یہ چھپکلیاں درزوں اور کونے کھدروں میں کہیں نہ کہیں چمٹی رہتیں اور موقع ملتے ہی حملہ کر دیتیں۔

جیسے جیسے اس کی صحت گرنے لگی تھی وہ لوگوں سے شرمانے لگا تھا۔ اسے مضبوط اور صحت مند لوگوں سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ ان سے ملتے ہوئے گھبراتا تھا اور اکثر کنی کترا کر نکل جاتا۔ اسے ہمیشہ دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی شخص وہ بات ۔۔۔۔۔۔۔ وہ خوفناک بات اس کے منہ پر نہ کہہ دے جسے وہ دل میں لاتے ہوئے بھی خوف کھاتا تھا۔ وہ چپ چاپ دن بھر اپنے کام میں مصروف رہتا اور بہت کم کسی سے بات کرتا۔ اب موت کا خیال چوبیس گھنٹے اس کے ذہن پر مسلط رہتا۔ وہ ہر شے کو یوں دیکھتا گویا وہ اس کی الوداعی نظریں ہوں۔ سونے سے پہلے وہ اپنے کمرے میں کتابوں، کیلنڈروں، فریم میں جڑی ہوئی آئیل پینٹ تصویروں، کھونٹی پر لٹکے ہوئے کپڑوں، دروازے کی کنڈی، روشندانوں کے شیشوں اور چھت کی کڑیوں کو حسرتناک نگاہوں سے تکتا جیسے وہ انہیں آخری بار دیکھ رہا ہو۔ جیسے اسے یقین ہو گیا ہو کہ وہ صبح ان چیزوں کو دیکھنے کے لیے اس کمرہ میں زندہ نہ ہوگا۔ لیکن اچانک ایک عجیب وغریب تبدیلی رونما ہوئی۔

وہ تندرست ہونے لگا۔ اس کی گرتی ہوئی صحت سنبھلنے لگی۔ جیسے کوئی سیڑھیوں پر سے مسلسل پھسلتا چلا آ رہا ہو اور آخری سیڑھیوں پر پہنچ کر سنبھل جائے اور کپڑے جھاڑ کر اطمینان سے اترنا شروع کر دے۔ اس کا بخار ٹل گیا اور کھانسی کے دورے بھی کم ہو گئے۔ اسے دفعتاً احساس ہوا کہ وہ قبرستان کی مردہ فضا سے بارونق شہر کی ہماہمی اور نت نئی رنگینیوں میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے اجڑے ہوئے ویران چہرے کی رونق بہت حد تک واپس آ گئی اور وہ کام میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔

دن بھر دوستوں سے جی بھر کر ہنسی مذاق کرتا' دھوپ' روشنی اور لوگوں کی باتوں اور درختوں پر چہچہانے والے پرندوں کی میٹھی بولیوں کا لطف اٹھاتا اور رات کو بھرپور نیند سوتا۔ صرف کبھی کبھی بازار سے کوئی جنازہ گزرتے دیکھ کر یا کہیں موت کا ذکر سن کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ جیسے موت کوئی قرض خواہ ہو جس کی ایک بہت بڑی رقم اس کے ذمے واجب الادا ہو۔ تاہم وہ عام طور پر خوش رہنے لگا۔ اس کے دماغ میں سادہ روشن اور تندرست خیالات آنے لگے اور وہ ان مہلک اور خوفناک خیالوں سے دور ہوتا گیا جو ایک مدت سے اس کی روح کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔

ایک سال گزر جانے پر جبکہ اس کی گئی ہوئی تندرستی تقریباً واپس آ چکی تھی اور وہ تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا تو اسے کسی خاص مصلحت کی بنا پر نامعلوم عرصے کے لیے روپوش ہونا پڑا۔ ایک شام وہ سوٹ کیس اٹھائے دفتر سے نکل کر سٹیشن پہنچا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ گاڑی رات بھر میدانوں' کھیتوں اور ویرانوں میں سفر کرتی رہی' تیسرے درجے کی مدھم روشنی میں لوگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے اونگھ رہے تھے اور ان کے غمزدہ چہروں پر بے بسی اور درد کی جھلک تھی۔

علی الصبح جب کہ مشرقی آسمان پر سورج کی پہلی کرنیں نمودار ہونے کو تھیں اور ٹمٹماتے ستاروں کی ہلکی چمک میں رات کے آخری کمزور سائے ماند پڑ رہے تھے وہ ایک غیر آباد چھوٹے سٹیشن پر اتر پڑا۔ موسم گرما کا اخیر تھا اور صبح کی تازہ ہوا میں کھیتوں کی مہک اور شبنم کی نمی تھی۔

وہ ایک طرف پیدل چل پڑا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ تاروں کی چھاؤں میں تین چار میل چلنے کے بعد وہ ایک قصبے میں داخل ہو گیا۔ اب سورج نکل آیا تھا اور چوڑے اور ہموار کھیتوں میں دور تک روشنی ہی روشنی پھیل گئی تھی۔ قصبے میں اس نے یکہ کرائے پر لیا اور دس میل مشرق کی جانب ایک پرانے تاریخی گاؤں میں پہنچ کر اتر پڑا۔ وہاں سے چار میل کچے اور غیر ہموار سفر کے بعد وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ یہ ایک گمنام اور تنہا گاؤں تھا جہاں اس کا ماموں اپنی تھوڑی سی زمین کے سہارے پورے کنبے کا پیٹ پال رہا تھا۔ یہاں آ کر اس نے بہت جلد اپنے لیے ایک کام تلاش کر لیا۔ وہ دن بھر ماموں کے بچوں کا انگریزی اردو وغیرہ پڑھاتا اور شام کو ادھر

ادھر کافی لمبی سیر کے بعد اپنی کوٹھری میں دیا جلا کر دیر تک پڑھتا لکھتا رہتا۔ اس کی کوٹھری کے بالکل سامنے ایک پرانا تالاب تھا جس کی سطح پر سبز کائی لگ رہی تھی اور گندے پانی میں بقول اس کے ماموں بوڑھی اور بیمار مچھلیاں رہتی تھیں۔ کسی وقت علی بخش لوہار کی دوکان پر جا کر اس گاؤں کی صفائی اور وہاں ایک اسکول کھولنے کی اسکیم پر باتیں کرتا رہتا۔

سردیوں کی آمد کے ساتھ ہی جبکہ کھیتوں میں گنے کی کاشت شروع تھی اور راتیں ٹھنڈی ہوگئی تھیں اور ڈھور ڈنگر چھتوں کے نیچے بندھنے لگے تھے اسے ایک رات ہوا سی لگ گئی اور بخار ہوگیا۔ رات بھر اس کا پنڈا گرم رہا مگر صبح ہوتے ہی بخار خود بخود اتر گیا اور وہ اٹھ کر بھلا چنگا ادھر ادھر گھومنے پھرنے لگا۔ لیکن شام کو بخار نے پھر آ لیا۔ اس کے ماموں نے مسجد کے امام سے جو حکیم بھی تھے دوا منگوا کر عرق گاؤزبان میں گھول کر اسے پلائی مگر ہلکا ہلکا بخار بدستور موجود رہا۔ وہ ایک دم پریشان سا ہوگیا۔ جیسے کسی نمازی کے آگے سے کوئی بچہ گزر جائے اور اس کے سکون اور عبادت میں خلل آ جائے اور اسے نیت توڑ دینا پڑے۔

وہ بھیانک اور خوفناک خیال جو اس کے دل کے کسی کونے میں دبا پڑا تھا موقع پاتے ہی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا اور کسی فاتح کی طرح اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ دن کے وقت وہ بچوں کو پڑھانے اور ادھر ادھر گھومنے پھرنے میں مشغول رہتا مگر رات کو جب وہ مطالعہ ختم کر کے دیئے کو پھونک مار کر کمبل منہ پر کھینچتا تو اندھیرے کی دبیز تہوں میں وہ خوفناک خیال ایک تاریک غار کا روپ دھار کر منہ کھولے دھیرے دھیرے اس کی طرف سرکنے لگتا۔ اس کا بدن پہلے کی طرح ایک بار پھر کمزور پڑنے لگا۔ چہرے کا رنگ پیلا اور سبزی مائل ہونا شروع ہوگیا۔ زیادہ چلنے پھرنے کے بعد اس کا بند بند دکھنے لگتا' بدن میں نقاہت آ جاتی اور دم پھول جاتا۔

ایک دن جنوری کی ایک چمکیلی اور روشن دوپہر کو ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اس کے سینے میں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی اور اس کی اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ وہ درد کو دبائے علی بخش لوہار کی دوکان پر بیٹھا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ تالاب کے قریب چھپڑے کے پاس پہنچ کر اس پر اچانک کھانسی نے حملہ کر دیا اور وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ یہاں اس نے پہلی بار خون تھوکا۔

کوٹھری میں پہنچ کر دروازہ بند کرتے ہوئے اس پر پھر کھانسی کا دورہ پڑا اور اس کے منہ سے خون کا لعاب بہہ نکلا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب کھیل ختم ہوا چاہتا ہے۔

اس کا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے منہ پر سے کمبل سرکایا اور وہ ہانپنے لگا جیسے اس نے کسی وزنی پتھر کو اٹھا کر دے پھینکا ہو۔ طاق میں جلتے ہوئے دیئے کا تیل ختم ہو رہا تھا اور اس کی نرم روشنی دم بدم پھیکی ہو رہی تھی۔ سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی شیروانی کے قریب

ہی ایک سیاہ رنگ کی چھپکلی کسی شے پر داؤ لگائے بالکل ساکت وجامد ہوگئی تھی۔ جیسے مرگئی مدھم روشنی میں شیروانی ایک ایسی لاش لگ رہی تھی جسے پھانسی کے بعد شہر کے دروازے پر لٹکا دیا گیا ہو۔ سوٹ کیس پر رکھے ہوئے گرد آلود پھول کر دو بڑی بڑی قبروں میں تبدیل ہوگئے جن میں کیڑے مکوڑوں نے اپنے گھر بنا رکھے ہوں۔

موت آگئی' موت آگئی۔

کوٹھڑی کی نیم روشن بیمار فضا میں جیسے چمگادڑیں غوطے لگا رہی تھیں۔ اس نے خیال ہی خیال میں دیکھا لوگ اس کا جنازہ لیے گاؤں کے قبرستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس کا ماموں سب سے آگے آگے ہے۔ اس لحد میں اتارا جا رہا ہے۔ اس پر گلاب چھڑکا جا رہا ہے اور پھر قبر مٹی سے بھری جا رہی ہے۔ وہ دبا جا رہا ہے پسا جا رہا ہے۔ اس کے سینے پر منوں مٹی کا سنگین بوجھ پڑ گیا ہے۔ اس کی چھاتی پھٹنے لگی ہے۔ سانس رکنے لگی ہے۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ مگر چیخ مدھم اور بے حد نحیف تھی۔ جیسے اس نے ہلکی سی آہ بھری ہو۔ اس نے بولنا چاہا مگر آواز اس کے حلق میں یوں تحلیل ہوگئی جیسے خشک ریت میں پانی ایک تاریک پردہ اس کی آنکھوں میں کھینچ گیا جس پر بڑے بڑے سرخ دھبے ناچ رہے تھے۔

اسے یقین ہوگیا کہ موت نے آخر اسے آلیا ہے۔ اب وہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے۔

اسے اپنی ماں کا خیال آیا وہ کیا کر رہی ہوگی۔ شاید وہ سو رہی ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا غمزدہ بیٹا اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا تو اسے بالکل خبر نہ ہوگی۔ اس نے آج تک اس کی کوئی خدمت نہ کی تھی۔ کاش وہ اسے معاف کر دے۔

اسے طاہرہ یاد آئی۔ ایکا ایکی باریک ہونٹوں کے شبنمی لمس کو اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر محسوس کرنے کی خواہش شعلے کی طرح اٹھی۔ مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جہاز کا تین چوتھائی حصہ ڈوب چکا تھا۔ وہ اس جہاز کو کسی نہ کسی طرح ڈوبنے سے بچا لینا چاہتا تھا۔ وہ موت سے پہلے مرنے کو تیار نہ تھا۔ وہ ابھی نہیں مرنا چاہتا تھا۔ لیکن جہاز ڈوب رہا تھا آہستہ آہستہ نیچے اور نیچے ------- پانی تیزی سے اندر داخل ہو رہا تھا۔ اب صرف عرشہ اور چمنیاں ہی باقی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں غم اور دکھ کے آنسو جھلملا اٹھے۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں بند کر لیں اور گرم آنسو اس کے گالوں پر لڑھک گئے۔

اس کے سینے کا درد اب بالکل بند ہو چکا تھا اور سانس گہری اور پرسکوں ہوگئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا گویا وہ بالکل تندرست ہو اور کبھی بیمار نہ رہا ہو۔ موت کے قریب پہنچ کر وقت اور فاصلے کی حدیں اٹھ گئی تھیں اور وہ ہر شے کو ماضی' حال اور مستقبل کو بے نقاب دیکھ

رہا تھا۔ اسے اس بات کا اطمینان تھا کہ اگرچہ طاہرہ کی محبت اسے نصیب نہیں ہو سکی اور گولڈ فلیک کے سگریٹوں سے وہ ہمیشہ محروم رہا تھا اور خوشحال گھرانے کی جگہ اس نے اپنی جوانی کے بیش قیمت سال جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند رہ کر گزار دیئے تھے۔ پھر بھی اس کی زندگی رایگاں نہیں گئی تھی۔ اپنے لیے نہ سہی لیکن لوگوں کے لیے اس نے کچھ نہ کچھ ضرور کیا تھا جو اس زمین پر زندہ رہنے کے باوجود زندگی کے حقوق سے محروم تھے۔ جو شہروں میں بسنے والے انسانوں کے لیے کو دبھوکے رہ کر روٹی مہیا کرتے تھے اور ننگے رہ کر ان کے بچوں ان کی عورتوں کا تن ڈھانپتے تھے۔ جو منہ اندھیرے اٹھ کر آنکھوں میں نیند کا خمار لیے کارخانوں کا رخ کرتے تھے۔ جو دہکتی ہوئی بھٹیوں کے سامنے دن بھر لوہا کوٹتے تھے اور فاقہ کرتے تھے۔

وہ مر رہا تھا مگر اسے پورا بھروسہ تھا وہ بیج اس نے بویا تھا ایک نہ ایک دن دھرتی کا سینہ چیر کر ضرور پھوٹ پڑے گا۔ وہ درخت جن کی اس نے آبیاری کی تھی ایک دن جھنڈروں کی شکل میں اٹھ کھڑے ہوں گے وہ نہیں ہو گا مگر اس کے لاکھوں تھکے ماندے بھائی ان کی گنجان چھاؤں میں آرام کریں گے۔ اس کا کام اتنا اہم نہیں تھا کہ اس سے تاریخ کا رخ پلٹ سکتا وقت کا دھارا موڑا جا سکتا۔ تاہم وہ اتنا معمولی بھی نہ تھا کہ اسے نظر انداز کر دیا جاتا۔ وقت کی عظیم ترین مشین میں اس نے ایک اہم ترین پرزہ کا کام سرانجام دیا تھا اور یہ پرزہ اپنی جگہ پر ایک مکمل مشین کی حیثیت رکھتا تھا۔

سورج طلوع ہونے کو تھا۔ چشموں کا پانی ابلنے کو تھا۔ بیج دھرتی کی چھاتی سے پھوٹ نکلنے کو تھا۔ چھوٹی چھوٹی ان گنت لہریں سمندر کی سطح پر ابھر رہی تھیں اور یہ چھوٹی لہریں جب آپس میں مل کر بہنے لگتیں تو بپھرتی ہوئی موجوں کا روپ دھار لیتیں اور بپھرتی ہوئی موجیں۔

اس نے آہستہ سے پلکیں کھول دیں۔ اسے ہر شے مدھم اور دھند میں لپٹی ہوئی نظر آنے لگی۔ کھڑکی میں رکھی ہوئی چیزیں، سوٹ کیس پر پڑے ہوئے گرد آلود بوٹ دیوار سے لٹکی ہوئی شیروانی سب کچھ بے معنی اور مبہم معلوم ہونے لگا جیسے وہ انہیں بہت دور سے دیکھ رہا ہو۔ اسے اپنے ماموں کا خیال آیا۔ اس کی عام کسانوں ایسی سیدھی سادی صورت سا کی آنکھوں میں اتر گئی اور پھر یہ صورت جیسے خود بخود کہیں ڈوب گئی۔ گزرے ہوئے دن دوستوں اور پیاروں کے میٹھے اور کڑوے بول، دیکھے بھالے مہربان اور نامہربان چہرے اجنبی اور غیر مانوس اشیاء کی طرح اس کے سامنے سے گزر کر بلبلوں کی مانند یکے بعد دیگرے پھٹتے گئے۔ اس نے ہونٹ ہلانے چاہے مگر اس کوشش میں ناکام رہا۔ اس کے ہونٹ جیسے سوج کر بوجھل ہو گئے تھے جیسے کسی نے ان پر گوندھے ہوئے آٹے کا پیڑا رکھ دیا ہو۔ اس نے ایک ہاتھ اٹھانا چاہا مگر وہ بمشکل اسے ہلا سکا۔ کوئی ان دیکھی، پراسرار طاقتور شے بڑی تیزی سے اس کے جسم کی رہی

سہی طاقت کو بھی ختم کر رہی تھی۔

کھیل ختم ہو رہا تھا اور اب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بھی اس کی زندگی میں ایک دن کا اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔ دیئے کی لو مدھم سے مدھم تر ہو رہی تھی ماند پڑتی ہوئی پھیکی روشنی طاق کے گرد سمٹ رہی تھی اور وہ بڑے سکون کے ساتھ زندگی سے دور ہو رہا تھا دھند تاریکی موت۔

اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں اور وہاں سفیدی چھانے لگی تھی۔ اس کی نظر جیسے واپس اس کی آنکھوں میں آ رہی تھی۔ اس نے دیوار پر سیاہ چھپکلی کو کسی شے پر جھپٹتے دیکھا۔

اور یہ زندگی کا آخری نشان تھا۔

اس کے بعد کیا ہوا؟۔۔۔۔۔۔۔۔وہ دیکھنے، سمجھنے، سوچنے اور سننے کی حدود سے پرے بہت پرے پہنچ چکا تھا۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ دیا بجھ گیا۔ کوٹھڑی میں مکمل اندھیرا چھا گیا اور باہر سرد آسمان پر ستاروں کی ٹولیاں بلک بلک کر چمکنے لگیں، ڈوبنے لگیں اور ڈوبتی گئیں اور مشرق کی جانب پہاڑیوں کے اوپر طلوع ہونے والے سورج کا نور پھیل گیا۔ اوس میں بھیگے ہوئے جھکے ہوئے گیہوں کے نازک خوشوں پر شبنم کے آنسو تڑپ تڑپ نیچے گرنے لگے۔

اور لحظہ بہ لحظہ بڑھتے پھیلتے نور کی ہلکی روشنی کوٹھری کی بند کھڑکی کی درزوں میں سے چھن کر دھرتی کے گمنام لال کے پر سکوں چہرے پر کافور بن کر بکھر گئی اور تازہ ہوا نے مہربان ماں کی طرح شہید بیٹے کی پیشانی پر اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

◆ ◆ ◆

منزل منزل

راجدہ نے کہا تھا' میرے متعلق افسانہ نہ لکھنا میں بدنام ہو جاؤں گی۔

اس بات کو آج تیسرا سال ہے اور میں نے راجدہ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا اور نہ کبھی لکھوں گا۔ اگرچہ وہ زمانہ جو میں نے اس کی محبت میں بسر کیا میری زندگی کا سنہری زمانہ تھا اور اس کا خیال مجھے ایک ایسے باغ کی یاد دلاتا ہے جہاں سدا بہار درختوں کی پر سکون چھاؤں میں سچے گلاب کے پھولوں کے جھاڑ مسکرا رہے ہوں اور جس کی کھلی اور آزاد روشوں پر خوشحال لوگ محو خرام ہوں۔ پھر بھی اس باغ کے متعلق کچھ نہیں کہوں گا۔ خواہ اس میں راجدہ کی نیک نامی ہو یا بدنامی ------- جب سے راجدہ جدا ہوئی ہے میں نے گلاب کے پھولوں اور کھلی روشوں والے اس باغ کے دروازے بند کر دیئے ہیں اور راجدہ کو مجھ سے جدا ہوئے آج تیسرا سال ہے۔

اس عرصہ میں راجدہ کو میں نے ایک پل کے لیے بھی نہیں دیکھا اور شاید اس نے مجھے بھی نہ دیکھا ہو۔

ہم ------- جو ایک دوسرے کی پل بھر کی جدائی برداشت نہیں کر سکتے تھے' زندگی کے تین سال ایک دوسرے سے جدا رہ کر چپ چاپ بسر کر گئے ہیں۔ ان تین سالوں پر سے گذر کر پیچھے کی طرف جاتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں جھڑے ہوئے پتوں والی ایک پژمردہ سڑک پر چل رہا ہوں جو قبرستان سے ہو کر گزرتی ہے۔

ان دنوں میں لاہور میں ایک اخبار کے دفتر میں ملازم تھا۔ گھر چونکہ امرتسر میں تھا لہذا شام کی گاڑی سے واپس اپنے گھر چلا آتا تھا۔ اگرچہ لاہور میں بڑی آپا کا گھر تھا اور وہ لوگ میری ہر صبح سفر اور ہر شام سفر پر مجھے اکثر پالتو کلرک کہا کرتے تھے۔ تاہم جو مزا اپنے چوبارے میں تھا نہ بلخ میں تھا نہ بخارے میں ------- علاوہ ازیں میری عادت ہے کہ میں امرتسری انگریزوں کی طرح سال میں چھ مہینے کام کرتا ہوں اور باقی چھ مہینے گھر بیٹھ کر ان چھ مہینوں کی کمائی کھاتا ہوں۔ ان اطوار کے پیش نظر اپنا گھر چھوڑنا عین حماقت تھی۔

لیکن راجدہ سے ملنے کے بعد میں نے امرتسر تقریبا چھوڑ دیا۔

آج سے تین سال پہلے موسم سرما کی وہ ایک گرم اور چمکیلی شام تھی۔ میں ابھی ابھی گاڑی سے اترا تھا۔ مجھے حسب معمول بھوک بھی لگ رہی تھی۔ تیز تیز قدم اٹھاتا' پر شور بازاروں اور دھندلی گلیوں میں سے گزرتا میں گھر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ بھی میں گھر کی

سیڑھیوں پر ہی تھا کہ مجھے اوپر بھانجی کی آواز سنائی دی۔ بھانجی اور میں ہم عمر تھے اور ایک ساتھ کھیلے اور بڑے ہوئے تھے۔ وہ کافی دنوں کے بعد اپنی نانی کے گھر آئی تھی اور میں اسے بڑے آرام سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں سیدھا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ کپڑے اتارے ٹھنڈے پانی میں غسل کیا اور کپڑے بدلنے لگا۔ بھانجی چھوٹے بھائی سے کسی نئی فلم کی ہیروئین کے بارے میں گرما گرم بحث کر رہی تھی۔ اس کے خیال میں ہیروئین ہیرو سے زیادہ خوبصورت تھی۔ مگر چھوٹا بھائی کہتا تھا کہ ہیروئین کی آنکھیں بھینگی ہونے کے علاوہ اس کی مونچھیں بھی ہیں۔ اس لیے وہ کسی طرح خوبصورت نہیں کہلائی جا سکتی۔

کپڑے بدل کر میں صحن میں آ گیا۔ بھانجی مجھے دیکھتے ہی اچھل پڑی۔ میں بھی تقریباً اچھل پڑا۔ سب قہقہے مار کر ہنسنے لگے۔ وہاں شور مچ گیا۔ جس میں میرے اور بھانجی کے قہقہوں کی آواز نمایاں تھی۔ یونہی میری نظر چق کے دوسرے آدھے حصے پر پڑی، وہاں بھانجی کی نند عطی بیٹھی ہمارے قہقہوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

"تو گویا آپ بھی ہیں؟"

اور میں چق اٹھا کر تیزی سے اس کے پاس پہنچ گیا۔ عطی کے ساتھ ایک اور لڑکی بیٹھی تھی جس نے مجھے دیکھ کر جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ میں ذرا ٹھٹک گیا۔ اتنے میں بھانجی بھی آ گئی اور اس لڑکی کو مجھ سے پردہ کرتے دیکھ کر بول اٹھی۔ "حد ہو گئی، بھلا ماموں سے کیسا پردہ؟"

"ہاں بھئی، بھلا یہ بھی کوئی پردے کا موقع ہے۔" عطی نے اس لڑکی کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں وہ لڑکی شرم سے سکڑی جا رہی تھی اور اس کے کانوں کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں۔ میں عطی اور بھانجی سے باتیں کر رہا تھا۔ باتیں کرتے ہوئے میں نے دو تین بار نظریں بچا کر اس لڑکی کو دیکھا۔ باریک ہونٹ، ستواں ناک، جھالریں پلکیں اور ہلکا گلابی رنگ ۔۔۔۔۔۔ چپ چاپ، بے زبان جیسے موم بتی ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تھی راجدہ۔

اس سے پہلے میں نے راجدہ کو کہیں اور نہیں دیکھا تھا۔ بھانجی نے بتایا کہ وہ عطی کے سسرال سے ہے اور میں نے سوچا اگر وہ عطی کے سسرال سے نہ ہوتی تو مجھے کہاں ملتی؟ ویسے راجدہ کا مجھ سے ملنا ناگزیر تھا۔ یہ میں اب سوچتا ہوں۔ شام کے کھانے کے بعد سیر کا پروگرام بن گیا اور ہم سب کمپنی باغ کی طرف چل پڑے۔

باغ ابھی فاصلے پر تھا کہ شام کے ٹھنڈے سائے ماند پڑ گئے اور مرطوب ہوا کے نیم گرم جھونکے ہمارے جسموں سے چھوئے۔ باغ میں داخل ہوتے ہی ہم نے چنبیلی اور مولسری کے پھولوں اور ایسی مٹی کی خوشبو سونگھی جسے نہر کے پانی سے سیراب کیا گیا ہو اور

جہاں سے سارا دن تیز دھوپ میں گرم بخارات اٹھتے رہے ہوں۔ شہر کی نسبت یہاں کی فضا آزاد اور مرطوب تھی۔ گرم ہوا بڑی نرمی سے چل رہی تھی اور گھنے درختوں کی گہری سبز شاخیں بے معلوم انداز میں ہل رہی تھیں۔ سڑک پر چھڑکاؤ کیا ہوا تھا اور بجلی کے پرانے لیمپوں کی زرد روشنی میں وہاں سے نظر نہ آنے والی بھاپ سی خارج ہو رہی تھی۔ پسینوں پر پسینے آ رہے تھے اور عورتیں برقعوں سے پریشان ہو رہی تھیں۔ پردہ کلب کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے اپنے برقعے اس پھرتی سے اتارے جیسے ان میں خطرناک بیماریوں کے جراثیم پیدا ہو گئے ہوں اور لپک کر کلب میں داخل ہو گئیں۔ اندر چاروں طرف پردہ ہی پردہ تھا اور کلب کا کہیں نشان تک نہ تھا۔ گھاس کے معمولی سے خطے کے عین وسط میں آم کا درخت تھا جس کے پاؤں میں ایک دو شکستہ بنچ پڑے ہوئے تھے اور دوسری طرف دو پینگیں لٹک رہی تھیں۔ عورتوں کو یہاں دو چیزیں کھینچ لاتی تھیں۔ پہلی چیز کلب کی پینگیں اور دوسری برقعے سے نجات۔

میں کلب کے باہر بوڑھے پہرے دار کے مصلے پر بیٹھ گیا اور اس سے وضو کے فوائد اور نماز کی برکتوں پر لیکچر سنتا رہا۔ وہ تسبیح پھیرتے ہوئے باتیں کر رہا تھا اور میں بڑی توجہ سے اسے تک رہا تھا۔ دراصل میں اسے نہیں بلکہ ان دوڑتے ہوئے سپید سپید پاؤں پھڑ پھڑاتی شلواروں کو تک رہا تھا جو بوڑھے کی گردن کے پیچھے سے مجھے جھاڑیوں کے عقب میں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

کافی دیر بعد بھانجی، عطی، راجدہ، اماں اور چھوٹی بہنیں اور بچے باہر نکلے۔ ان سب کی سانس پھولی ہوئی تھی اور ان کے جسموں سے گرم گرم پسینے کی تیز تیز بو اٹھ رہی تھی۔ پردہ کلب سے ذرا آگے جا کر سپید گنبد والا ریڈیو اچانک شروع ہو گیا اور نور جہاں کی تیز آواز سارے کمپنی باغ میں پھیل گئی۔

------آ رات جا رہی ہے------

ہم لوگ گنبد کے دائیں طرف والے نئے پلاٹ میں داخل ہو گئے جہاں سرخ اینٹوں والی چمکیلی روشوں پر سرخ اور زرد گلاب کے پھولوں کی بیلیں سایہ کئے ہوئے تھیں اور نیچے پلاٹ میں پانی دیا ہوا تھا۔ میں عطی اور اماں ایک سنگی نشست پر بیٹھ گئے اور نور جہاں کا گانا سننے لگے۔ یہ جگہ ایک لمبے اور گنجان درخت کی اوٹ میں تھی اور قریب ہی جھاڑیوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ اماں بڑے غور سے گانا سن رہی تھی۔

”یہ بے بی نور جہاں ہے۔“ اماں نے عطی سے کہا۔

دوسرے لوگ پلاٹ کی روشوں پر آزادی اور مسرت کے ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ان کی ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں باغ کی گرم اور کھلی فضا میں گونج رہی تھیں۔

”راجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے۔“ یہ آواز بھانجی کی تھی۔

میں نے پہلو بچا کر دیکھا۔ راجدہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی سفید شلوار کے پائنچے اٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی۔

”اوئی۔۔۔۔۔۔پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آ جاؤ۔۔۔۔۔۔۔میں بھی آ جاؤں؟ مجھے کیسے؟“

لیکن راجدہ نے بھانجی کو بلایا تھا‘ جو تھوڑی دیر بعد پانی میں اتر گئی اور بچوں نے بھی بڑوں کا ساتھ دیا۔ پانی گدلا تھا اور اس کی سطح پر زرد گھاس اور سوکھی ٹہنیوں کے ٹکڑے تیر رہے تھے‘ اور جو بچوں کے گھٹنوں تک آتا تھا۔ بچے ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے اڑاتے‘ شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ان میں میری چھوٹی بہنیں بھی تھیں اور چھوٹے بھائی بھی۔۔۔۔۔۔۔ بھانجی راجدہ کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی اور راجدہ ایک تتلی کی مانند پھرتی سے بھاگتی ہوئی کبھی ایک پودے کا چکر لگاتی اور کبھی لپک کر دوسری طرف نکل جاتی۔ میرا دل بھی پانی میں اتر جانے کو چاہا مگر امی کو دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی۔ آخر میں نے عظمی سے کہا۔

”بھابھی بھلا کیوں بیٹھی ہو‘ چلو پانی میں۔“

”نا بابا میرے پائنچوں کی کلف اتر جائے گی اور میں ایک ہی شلوار ساتھ لائی ہوں۔“

جب یہ لوگ تھک گئے تو شلواریں قمیصیں جھاڑتے پانی سے باہر نکل آئے۔ بچوں نے سارے کپڑے پانی میں بھگو ڈالے تھے۔ راجدہ کے بال کھل گئے تھے جنہیں وہ لاپروائی سے پیچھے ڈال رہی تھی۔ اس کی پیشانی اور مونچھوں والی جگہ پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے سڑک والے لیمپ کی طرح روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ اتفاق سے میں راجدہ کے قریب کھڑا تھا اور راجدہ نے کئی بار مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے گلہ ہو کہ میں عظمی کے پاس کیوں بیٹھا رہا اور پانی میں کیوں نہیں اترا۔ جب وہ سینڈل کے تسمے باندھنے کے لیے جھکی تو ساکت فضا میں نرم ہوا کی لہریں سی پیدا ہوئیں اور میں نے راجدہ کے پسینے میں ملی ہوئی حنا کی گرم اور خوشگوار خوشبو سونگھی۔

جب ہم باغ سے نکلے تو ہوا بڑے پیارے انداز میں چلنے لگی۔

سڑک کے کنارے والے درختوں کی خاموش گھپاؤں میں بے معلوم سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔

گرمیوں کی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کے چمکیلے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے اور کمپنی باغ جہاں سے ریڈیو کی آواز ابھی تک آ رہی تھی‘ ہمارے پیچھے رہ گیا تھا۔ عظمی اور اماں آگے آگے تھیں‘ راجدہ اور بھانجی ان کے پیچھے اور میں ذرا پرے ہٹ کر بچوں کو لیے چل رہا تھا۔ راجدہ قدرے اونچی آواز میں بھانجی سے ہم کلام تھی۔

”سچ میں تو ایسی راتیں باغوں میں ہی گزارنا چاہتی ہوں۔ بس پائنچے اٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں اور جب تھک جاؤں تو گلاب کی پھولوں بھری بیلوں کے سائے میں ٹھنڈے بنچ پر سو جاؤں۔

خدا کی قسم گرمیوں میں گھروں اور گلیوں میں میرا دل بہت گھبراتا ہے۔

وہ بڑی بے باکی سے اپنی خواہشات کا اظہار کر رہی تھی اور میں اس سوچ میں تھا کہ یہ وہی راجدہ ہے جو عطی کے ساتھ چق کی اوٹ میں بیٹھی ہوئی تھی اور جس نے مجھے دیکھ کر پردہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن پھر شام کے وقت سیر کی تیاری ہونے لگی۔ اس روز میرا پروگرام راجدہ کو کرسٹل میں آئس کریم کھلانے کا تھا۔ چنانچہ صبح ہی میں نے اپنی ایک ڈکشنری بیچ ڈالی۔ جس کے عوض مجھے چھ روپے بارہ آنے ملے تھے۔ یہ رقم چھ سات لوگوں کو آئس کریم کھلانے کے لیے کافی تھی۔ سیر کے بعد میں ان سبھوں کو کرسٹل میں لے آیا۔ کرسٹل کے ایک کیبن میں سوائے میرے اور چھوٹے بھائی کے سب لوگ بیٹھ گئے۔ ہم کرسٹل کے ہال کمرے میں بیٹھ گئے۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے مجھے راجدہ کی شکل اچھی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ وہی باریک ہونٹ' خوبصورت ستواں ناک' لمبی پلکوں کے پرسکوں سایوں والی آنکھیں جو بڑی نرمی اور محبت سے ایک منظر سے دوسرے منظر کی طرف گھومنے کی عادی تھیں۔ ماتھے کے اوپر سر کے سیاہ بالوں کی ابھری ہوئی دو پہاڑیاں اور ان کے درمیان میں بہتی ہوئی مانگ کی دودھیا نہر ۔۔۔۔۔۔ کرسٹل کے لیڈیز کیبن کے شیشوں میں سے راجدہ نے پہلی مرتبہ مجھے ہمدردی اور محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے دیکھا اور میرے دل اس کی عزت اور توقیر اور بڑھ گئی۔ جیسے اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

راجدہ کی نظریں طلوع ہوتے ہوئے سورج کی اولین نرم اور پاکیزہ کرنیں تھیں جو نیند میں شرابور پھولوں کے لیے پیغام بیداری لے کر آتی ہیں۔

کرسٹل سے نکل کر ہم لوگ گھر کی طرف جا رہے تھے۔ ایک جگہ بازار میں اندھیرا سا تھا اور لوگ بھی نسبتاً کم آ جا رہے تھے۔ راجدہ نے نقاب اٹھا کر پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا۔ سیاہ نقاب میں اس کا صندلی خوبصورت چہرہ ۔۔۔۔۔۔ جیسے رات کی تاریکی میں کسی خانقاہ کا کھلا اور روشن طاق' جہاں موم بتیاں جل رہی ہوں۔ (دراصل راجدہ کو پہلی بار دیکھنے سے جو خیال سب سے پہلے میرے ذہن میں آیا تھا' وہ محض ایک موم بتی کا خیال تھا۔ موم بتی' خاموش اور بے زبان) میرے ساتھ چونکہ بچے بھی تھے چنانچہ لازمی طور پر سب سے پیچھے تھا۔ راجدہ بھی ہولے ہولے پیچھے آتی گئی۔ قریب پہنچ کر اس نے بچوں کو تیز تیز چلنے کو کہا اور مجھے دیکھ کر بولی۔

’’آپ بھی بچے ہیں کیا؟‘‘ اور اتنا کہہ کر جلدی سے آگے نکل گئی۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس رات خواب میں راجدہ کو میں رات بھر کمپنی باغ کی سیر کرواتا رہا اور کرسٹل میں آئس کریم کھلاتا رہا۔

دوسرے دن۔۔۔۔۔۔۔دوپہر کے کھانے کے بعد کیرم بورڈ کھیلتے ہوئے سینما کا پروگرام بن گیا۔

فلم تھی ’’من کی جیت‘‘ جو مجھے بے حد پسند تھی اور میں چاہتا تھا کہ راجدہ بھی اسے دیکھے۔ دعوت بھی میں نے ہی دے ڈالی اور پھر اس سوچ میں پڑ گیا کہ ٹکٹوں کے لیے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ الف لیلیٰ‘ قصہ حاتم طائی باتصویر اور محبت بھرے خطوط‘ بہشتی زیور اور جنت کی کنجی بیچنے گیا مگر کسی دوکاندار نے یہ کتابیں نہ خریدیں۔ امی سے کچھ روپے ادھار مانگے لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ تنخواہ ملنے کے بعد میں دو تین دن امرتسر نہیں آیا کرتا۔ نہ معلوم راجدہ میری اس ذہنی پریشانی کو کس طرح بھانپ گئی۔ چنانچہ اس نے اعلان کر دیا کہ فلم ہم سبھی دیکھیں گے مگر اس شرط پر کہ ٹکٹیں اپنی اپنی لینی پڑیں گی۔ اس پر میں نے بڑی مخالفت کی‘ دل میں ڈرتے ہوئے کہ کہیں میری مخالفت کامیاب نہ ہو جائے۔ مگر خیریت گزری کہ راجدہ کی اسکیم بالاتفاق رائے پاس ہو گئی اور سینما کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نہایا گیا۔ کپڑے بدلے گئے۔ جوتے پالش ہوئے۔ امی نے پان کے ٹکڑوں سے ڈبیا بھر لی۔ بھانجی نے حنا کی ساری شیشی اپنے کپڑوں پہ انڈیل لی اور اس کی تیز خوشبو سے دماغ چکرانے لگے۔ ایک طرف راجدہ بال بنا رہی تھی۔ عطی نے استری گرم کر رکھی تھی اور تین چار رومال آگے ڈالے انہیں نم دے رہی تھی۔

میں نے کہا۔

’’بھابی! تم نے اچھا کیا‘ جو تین چار رومال رکھ لیے۔ فلم میں کئی بار آنسو نکل آتے ہیں۔‘‘

عطی بھابی مسکرانے لگی اور راجدہ نے بھانجی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

’’ہمیں رونا نہیں آتا۔‘‘

اور میں بے اختیار کہہ اٹھا۔ ’’خدا نہ کرے کہ رونا آئے۔‘‘

اور عطی نے زیر لب ہنس کر پوچھا۔

’’راجدہ کا بڑا خیال ہے۔‘‘

راجدہ شرم سے ڈوب گئی۔ میں خود بات کر کے پشیمان ہو رہا تھا۔ بھانجی نے پلٹ کر عطی کی طرف دیکھا جو رومال استری کر رہی تھی اور جس کے ہونٹوں پر اس کی ناک سے بھی زیادہ پتلی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور ہنس کر بدستور سوٹ کیس میں سے کچھ نکالنے

لگی۔

سینما ہال میں انٹرول کے وقت میں نے عطی سے فلم کے بارے میں اس کی رائے پوچھی، جس پر وہ شرما گئی۔ شاید اسے ستارہ ٹوٹنے والے استعارے کا خیال آ گیا تھا۔ جس کے فوراً بعد ہی انٹرول ہو جاتا ہے۔ راجدہ اور بھانجی، امی کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں اور ان سے پان لے کر کھا رہی تھیں۔ میں اٹھا اور پان خریدنے کے لیے باہر بازار میں آ گیا۔ پان میں نے علیحدہ علیحدہ بندھوائے۔ اس طرح مجھے یقین تھا کہ راجدہ کو بھی میں خود پان پیش کر سکوں گا۔ پان لیے جب میں بکس میں داخل ہوا تو فلم شروع ہو چکی تھی۔ اندھیرے اور فلم کی ہلکی روشنی میں مجھے ان لوگوں کے صرف سر ہی دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ایک ایک کر کے سب کو پان پیش کر دیئے اور جب راجدہ کی باری آئی تو میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اف توبہ! ۔۔۔۔۔۔ اس کا ہاتھ کس قدر سرد ہو رہا تھا، جیسے میں نے برف سے لدے ہوئے گلاب کے پھولوں پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ اس کے ہاتھ میں اس کے حصے کا پان ویسے ہی پڑا تھا اور باقی وقت ہال میں بیٹھا راجدہ کے ہاتھ کی نرمی اور سردی کو اپنے جسم میں پھیلتے محسوس کرتا رہا۔ فلم ختم ہو گئی اور ہم گھر آ گئے۔

رات بھر راجدہ کے ہاتھ کا سرد لمس مجھ پر دھند کے بادل کے ٹکڑے کی مانند سایہ فگن رہا اور میں نے اسی خیال میں رات گزار دی۔

صبح اتوار تھا۔ دوپہر کے وقت بھانجی نے ڈھولک بجانے کا پروگرام پیش کر دیا۔ جسے بچوں اور چھوٹی بہنوں نے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ تھوڑے ہی وقفے کے بعد کہیں سے کسی ہوئی تیز اور گھمک دار ڈھولک بھی آ گئی اور بچے الٹے سیدھے ہاتھ مارنے اور بے سری الاپنے لگے۔ بال آخر بھانجی آگے بڑھی اور ڈھولک ایک جچی تلی تال پر دھمکنے لگی۔ دو تین منٹ لگاتار خالی ڈھولک ہی دھمکتی رہی اور کسی کے گانے کی آواز نہ آئی۔ بھانجی تھم گئی اور چمک کر بولی۔

”بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔۔۔۔۔۔۔ گاتیں کیوں نہیں؟“

راجدہ نے شرما کر منہ پھیر لیا بھابھی عطی ہنسنے لگیں اور بھانجی کو غصہ آ گیا۔ اس کا گول گول منہ لال ہو گیا اور بھنویں سکڑ سی گئیں۔ اس نے ایک ہاتھ زور سے ڈھولک پر مارا اور گانا شروع کر دیا۔

”اساں گو بھی تڑکی اے
ادھی راتیں ویرا آیا ۔۔۔۔۔۔۔ گرگابی کھڑکی اے“

اس نے ڈھولک کی تھاپ کے درمیان ہی تیز آواز میں کہا۔

"بھئی یہ بری بات ہے گاؤ نا سب' آخر یہ منگوائی کس لیے ہے؟"

چنانچہ بھابی عطی نے منہ بنا کر گلا صاف کیا اور بول اٹھائے' اس کی نرم آواز لوچدار تھی۔

"پیا جھرمٹ بدلاں دا

روواں رات دنے۔۔۔۔۔۔۔اے وچھوڑا سجناں دا"

اب راجدہ کی باری تھی۔ اس نے گردن نیچی کر لی' عطی اور بھانجی اور بچے ہنسنے لگے۔ اتنے میں ایک نرم اور نکھری ہوئی آواز ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ اوپر اٹھی' شعلے کی طرح بے چین۔۔۔۔۔۔۔مضطرب اور زخم خوردہ۔۔۔۔۔۔۔

"دوپتر اناراں دے

ساڈا دکھ سن کے۔۔۔۔۔۔۔روندے پتھر پہاڑاں دے"

اور میرے ذہن میں ایک تصویر کھچ گئی جیسے کوہ بندھیاچل کے گھنے اور تاریک جنگلات میں موسلا دھار بارش ہو رہی ہو اور تیز رفتار پہاڑی نالے نشیب کی طرف دوڑ رہے ہوں۔

پھر ایک اور تصویر سامنے آئی۔ سادہ مگر سوگواری' جیسے شام کا گیت۔

سنسان پہاڑیوں پر رم جھم رم جھم' مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور ادھر ادھر پتھروں کی سیاہ اور چکنی سلوں پر سے رک رک' ٹھہر ٹھہر کر پھسلتے ہوئے بارش کے موتی۔۔۔۔۔۔۔پتھروں کے آنسو۔

روندے پتھر پہاڑاں دے۔۔۔۔۔۔۔

ڈھولک تھم گئی۔ شعلہ بجھ گیا۔ مگر سنسان اور گمنام پہاڑوں کے آنسو رک رک' ٹھہر ٹھہر کر بدستور گر رہے تھے۔ اور میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا تم کس کی یاد میں آنسو بہا رہے ہو؟

میں راجدہ سے پوچھنا چاہتا تھا' راجدہ تمہیں وہ کون سا دکھ ہے جسے سن کر پہاڑ بھی رونے لگے؟

میں راجدہ سے پوچھنے کے لیے آگے بڑھا اور راجدہ امرتسر کے پلیٹ فارم نمبر ۴ پر بھانجی اور عطی کے ہمراہ لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ اس کی آنکھیں سوگواری تھیں۔ گھنی پلکوں کی پرسکوں چھاؤں میں کہیں کہیں مدھم اور اداس دھوپ کی چمک تھی۔ گاڑی چل پڑی۔ پلیٹ فارم پیچھے اور گاڑی آگے کھسکنے لگی۔ راجدہ نے آخری بار مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں'

ہمارے گھر ضرور آنا۔

گاڑی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی اور میں اسٹیشن پر ادھر ادھر پھرتا رہا۔ مجھے واپس گھر جاتے ہوئے ایک قسم کی جھجک محسوس ہو رہی تھی، جیسے وہ میرا گھر نہ ہو۔

اسٹیشن سے نکل کر میں سیدھا کرسٹل چلا آیا اور کافی دیر وہیں بیٹھا رہا۔ جب شام ہوگئی تو میں اٹھا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ گلی اور بازار میں کافی رونق تھی، پر مجھے ہر شے اجنبی اور بے محل سی لگ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے کسی سے بات نہ کی اور کھانا کھا کر خاموشی سے لیٹ گیا۔ صبح اٹھا اور نوکری پر لاہور چلا آیا۔

لاہور پہنچتے ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کئی سال سمندر پار بسر کرنے کے بعد پہلی مرتبہ اپنے وطن میں داخل ہو رہا ہوں۔ سڑکوں پر لوگوں کے چہرے بڑے مانوس اور مہربان معلوم ہو رہے تھے جیسے ان کے دل میری ہمدردی اور دوستی سے لبریز ہوں۔ دفتر سے نکل کر میں نے کئی بار راجدہ کے گھر جانے کا ارادہ کیا مگر یہ خیال کہ اتنی جلدی وہاں چلے جانا مناسب نہیں، ہر بار مجھے روک دیتا۔

ایک روز بڑی آپا کو لاہور اچانک کوئی کام پڑ گیا۔ وہ میرے ساتھ لاہور آئیں اور میں انہیں راجدہ کے گھر لے گیا۔ میں راجدہ کے گھر میں پہلی دفعہ داخل ہو رہا تھا۔ وہ گھر ۔۔۔۔۔۔۔ جو بعد ازاں میرے دل پر اپنا گہرا اثر چھوڑ گیا ۔۔۔۔۔۔۔ عطی اور راجدہ ہمیں مکان کی ڈیوڑھی میں ہی مل گئیں وہ دونوں ایک بڑھیا سے جانے کیا خرید رہی تھیں۔ مجھے اور آپا کو اچانک اپنے مقابل دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئیں اور حیرت اور خوشی سے ان کے چھوٹے سے لب کھلے کے کھلے رہ گئے۔ راجدہ کے بال کھلے تھے۔ شاید وہ نہانے کی تیاری میں تھی۔ وہ ہم دونوں کو جلدی سے اوپر لے گئیں اور ہم درمیانی منزل میں پہنچ کر بیٹھ گئے۔ بھابی عطی نے پنکھا چھوڑ دیا۔

یہ کمرہ ہر قسم کے گھریلو سامان سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف قد آدم الماریوں میں چینی کے برتن سجے تھے دوسری طرف لمبے چوڑے خوبصورت پلنگ پر ریشمی تکیے اور دوسوتی کی سفید چادر پڑی تھی۔ نعمت خانے کے قریب میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ آدھے فرش پر مٹیالے رنگ کا ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ سنگھار میز کے گول آئینے پر جالی دار ریشمی پردہ لٹک رہا تھا۔ ایک طرف کوٹی اور پاؤنڈز اور پیرس کی شام کی مختلف سائز کی شیشیاں پڑی تھیں۔ کارنس پر دونوں طرف پتلی اور لمبی گردن والے پھولدانوں میں گلاب کے پھول مسکرا رہے تھے۔ قریب ہی ایک چمکیلا سگریٹ کیس اور ماچس اور کچھ کتابیں پڑی تھیں۔ کارنس کے اوپر خوبصورت فریم میں سجی ہوئی ایک رنگین تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ قدیم ایرانی تمدن کا ایک منظر تھا۔ شہر کا محراب دار پرانا دروازہ ۔۔۔۔۔۔۔ اس میں سے نکلتے اور داخل ہوتے ہوئے لمبے چغوں اور عماموں والے لوگ ۔۔۔۔۔۔۔ دروازے کے بائیں سمت جالی دار جھروکوں والے مکانوں کے

پیچھے اوپر کو اٹھتے ہوئے مسجد کے دودھیا مینار اور ان کے عقب میں نیلے آسمان پر سفید کبوتروں کی ٹولیاں۔۔۔۔۔۔ مجھے یہ تصویر بے حد اچھی لگی۔ راجدہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے جلدی سے تپائی رکھی اور باہر نکل گئی۔

پھر عطی آئی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھوں میں اخروٹ کی لکڑی کا ایک ٹرے تھا۔ جس میں جھاگ دار وٹو سے لبالب بھرے ہوئے دو گلاس رکھے تھے۔ آپا نے کہا کہ آخر اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ مگر میں خاموشی سے وٹو پینے لگا کیونکہ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد راجدہ کی ادھیڑ عمر پتلی دبلی بے زبان سے ماں اور دوسری بھابی اختر بھی آ گئی۔ وہ ہمیں خندہ پیشانی سے ملیں اور آپا کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ ان کی باتیں لاہور کی گرمی' پیراشوٹ کی کلیوں' ریل کی دقتوں' اور قمیصوں کے نت نئے نمونوں کے متعلق تھیں' جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ پھر بھی ان کی آوازیں مجھے بڑی خوشگوار محسوس ہو رہی تھیں۔ راجدہ بھی ایک طرف بیٹھی گفتگو میں شامل تھی۔ اس وقت گھر کی ہر چیز دیا سلائی کی ڈبی سے لے کر راجدہ کے کھلے بالوں تک مجھے اپنی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے یہ گھر میرا ہو جیسے اس گھر میں میں نے پہلی مرتبہ کھلے آسمان اور چمکیلی دھوپ کو دیکھا ہو اور اسی ایرانی قالین پر لڑھک لڑھک کر چلنا سیکھا ہو اور اسی گھر کے باہر نیم روشن ٹھنڈی گلیوں میں چالاک بچوں کی منڈلیوں میں اپنا بچپنا گذارا ہو۔ یہ اجنبی اور مہربان خیال مجھے راجدہ کے اور قریب لے گیا۔

پھر راجدہ کے دونوں بھائی آ گئے' ہنس مکھ اور دوست نواز۔۔۔۔۔۔ میں ان سے اٹھ کر ملا اور ہم دیوان خانے میں چلے آئے۔ یہ لمبا اور کھلا کرہ اوپر کی نسبت زیادہ سرد اور پر سکوں تھا۔ یہاں سوائے ایک بڑی الماری' زمین پر بچھی ہوئی دری اور میز کے علاوہ تین چار آرام کرسیوں اور آتش دان کی کارنس پر رکھی ہوئی قائداعظم کی تصویر کے اور کچھ نہ تھا۔ مجھے اس کمرے کی سادگی اور خنکی بے حد تسکین بخش محسوس ہوئی۔ ہم کچھ دیر تک وہاں بیٹھے نئی فلموں کے گانوں' تاش کے کھیلوں اور لیگ پارٹی کی خدمات پر باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ اس دوران مجھے اوپر سے راجدہ کے تیز اور بے ساختہ قہقہوں کی صحت مند آواز کئی بار سنائی دی۔ ساڑھے بارہ بجے دوپہر کی مجلس کا گجر بجا تو ہم اوپر چلے گئے۔ راجدہ خود ریڈیو لگا رہی تھی۔ پہلا ریکارڈ شروع ہوا۔

”من کاہے گھبرائے۔۔۔۔۔۔“

اور راجدہ نے کنکھیوں سے پل بھر کے لیے مجھے دیکھا اور مجھے سینما والی رات یاد آ گئی' جب پان پیش کرتے وقت میں نے اس کا نرم اور سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ گانے کی دھیمی اور دلنواز سریں کمرے کی پر سکوں اور خوشبوؤں بھری فضا میں تیر رہی تھیں اور

راجدہ سب کی نظریں بچا کر میری طرف دیکھ لیتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں چاندنی کی نرم خنکی اور بہار کی اولیں صبح کا اجلا پن تھا۔ اس کمرے میں بیٹھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اکھڑ اور اجڈ لوگوں سے بھری ہوئی کسی پر شور ریل گاڑی سے نکل کر نرم دل گارڈ کے ڈبے میں آن بیٹھا ہوں اور میں شام تک گارڈ کے ڈبے میں بیٹھا رہا اور اگر آپا چلنے کو تیار نہ ہوتیں تو شاید میں تمام عمر اس ڈبے میں بیٹھا سفر کرتا رہتا ۔۔۔۔۔۔۔ اسٹیشن پر اسٹیشن گزر جاتے' منزلوں منزلوں آتیں اور میرا اسٹیشن کبھی نہ آتا' میری منزل کبھی نہ آتی۔۔۔۔۔۔۔

آپا برقع پہننے لگیں۔ مجھے بھی کوٹ پہننا پڑا۔ جب ہم چلنے لگے تو راجدہ نے پوچھا۔

"پھر کب آئیں گے آپ؟"

آپا نے کہا۔" اب آپ لوگوں کو آنا چاہیے۔" لیکن ان لوگوں میں سے کوئی نہ آیا اور تیسرے دن میں خود راجدہ کے گھر چلا گیا۔ وہ شام نہایت خوشگوار تھی۔ بارش ابھی ابھی رکی تھی اور آسمان ابھی تک ابر آلود تھا۔ مکانات اور سڑکیں دھلی ہوئی تھیں اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بازاروں اور گلیوں میں لہرا رہے تھے۔ ٹھیک یاد نہیں غالباً ستمبر کا آخیر تھا۔

راجدہ کا بھائی گلی کے موڑ پر ہی مل گیا۔ گھر پہنچ کر ہم دیوان خانے میں بیٹھ گئے۔ اختر اور عطی بھی وہیں آ گئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد راجدہ بھی نیچے آ کر ہمارے قریب الماری میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ پھر چائے آ گئی۔ چائے کی سبز پھولدار پیالیاں ہاتھوں میں تھامے ہم لوگ گرمجوشی سے باتیں کر رہے تھے کہ باہر ڈیوڑھی میں سائیکل کھڑا کرنے کی آواز آئی۔ سب ایک دم چپ ہو گئے۔ راجدہ کا بھائی زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ "چچا آ رہے ہیں۔"

اور پھر دروازہ کھلا اور ایک چچا نمودار ہوا جس نے نیکر پہنی ہوئی تھی اور جس کے گندمی چہرے کی کھال کرخت اور کھنچی ہوئی سی تھی۔ ایک ہاتھ سے مہندی لگا سر جھاڑتا ہوا وہ ہمارے قریب آ کر رک گیا۔ میرا تعارف کروایا گیا۔ مگر اس نے میری طرف سرسری انداز میں دیکھا اور بڑی بے نیازی کے ساتھ میری کرسی کے عقب سے ہو کر ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے پاسنگ شو کا سگریٹ نکال کر اس نے سلگایا اور منہ سے دھوئیں کا غبار چھوڑتے ہوئے بولا۔

"آج قاعدآدم کی تقریر ہو رہی ہے۔"

پہلے تو میں لفظ "قاعدآدم" پر بالکل حیران نہ ہوا کیونکہ اس روز واقعی منٹو پارک میں قائداعظم کی تقریر ہو رہی تھی لیکن جب بعد میں چچا صاحب کی کاریگری کا احساس ہوا تو میں بمشکل اپنی ہنسی روک سکا۔

''ہاں ہو رہی ہے۔ تم بھی چلو گے چچا؟'' راجدہ کے بھائی نے کہا۔

پہلے تو چچا آنکھیں ملتا اور جھپکاتا رہا۔ پھر پاسنگ شو کا لمبا کش لگا کر بولا۔

''بھئی چلیں گے ضرور مگر شطرنج بھی ہمارے ساتھ جائے گی۔''

''حد ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔ چچا وہاں شطرنج کا کیا کام؟'' اور چچا پاسنگ شو کی راکھ جھاڑ کر بولا۔

''میاں۔۔۔۔۔۔ جب تقریر سنتے سنتے تھک جائیں گے تو پھر کیا کریں گے۔ اتنے بھرے مجمع میں سے اٹھ کر چل پڑنا بھی تو مناسب نہ ہوگا اور اگر شطرنج بھی پاس ہی ہوئی تو کیا کہنے پھر۔۔۔۔۔۔۔ قاعدآ دم خواہ ساری رات تقریر کرتا رہے۔''

اس کے بعد وہ اٹھا اور سر جھاڑتا ہوا باہر نکل گیا۔

راجدہ کے بھائی نے مجھے بتایا کہ چچا کو شطرنج سے حقیقی عشق ہے۔ اور وہ اکثر یاروں کی ٹولی میں گلی کے کونے پر بیٹھا' کمیٹی کے لیمپ کی روشنی میں رات رات بھر شطرنج کھیلتا رہتا ہے اور کچھ دیر تک میں راجدہ کے گھر میں بیٹھا' راجدہ کے خیال سے بے خبر' اس کے چچا کی دلچسپ شخصیت کے متعلق سوچتا رہا اور جب میں راجدہ کے گھر میں سے نکل کر گلی میں نکل رہا تھا تو مجھے اس کا چچا ایک خالی دکان میں دکھائی دیا۔ اس کے آگے شطرنج کی بساط پر مہرے بکھیرے ہوئے تھے اور وہ ایک ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑے مہروں پر جھکا ہوا تھا جیسے وہ خیال ہی خیال میں کسی غیبی آدمی سے بازی لگائے ہوئے ہو۔

دو تین ہفتے گذر گئے اور میں راجدہ کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک دن دوپہر کے وقت میں اپنے دیوان خانے میں بیٹھا چند نئی تصاویر کو البم میں لگا رہا تھا کہ ڈاکیے نے راجدہ کا خط چق اٹھا کر اندر پھینکا۔ یہ خط بڑی آپا کو لکھا گیا تھا لیکن اس میں ایک علیحدہ رقعہ میرے نام بھی تھا۔ راجدہ کی طرف سے میرے نام یہ اس کا پہلا خط تھا جسے میں نے کئی بار پڑھا اور جس کے مختصر اور پر محبت الفاظ بہت جلد مجھے ازبر ہو گئے۔ راجدہ نے جواب کے لیے اپنی کسی سہیلی کا پتہ لکھا تھا۔ میں نے اسی وقت قلم اور کاغذات لیے اور ایک ایک لمبا چوڑا خط راجدہ کو لکھ ڈالا۔ تیسرے ہی روز میرے خط کا جواب بھی آ گیا۔ میں نے اسی وقت ایک اور خط لکھ ڈالا جس کا جواب بھی تیسرے روز مجھے مل گیا۔ میرے لیے یہ کام راجدہ کو ملنے سے بھی زیادہ دلچسپ اور رومانوی تھا۔ چنانچہ میں نے قصداً راجدہ کے ہاں جانا بند کر دیا۔

اب اس کے خطوط میں خطرناک حد تک پہنچی ہوئی بے قراری اور بے چینی کا اظہار ہوتا تھا ایک خط میں لکھا آیا۔ ''میں بیمار ہوں۔''

اب میرے لیے مزید رکنا محال تھا۔ دوسرے ہی روز میں راجدہ کے ہاں نچلے کمرے میں بیٹھا اختر اور عطی سے باتیں کر رہا تھا۔ دراصل راجدہ بیمار نہیں تھی۔ یہ محض مجھے بلانے کے لیے ایک چال چلی گئی تھی۔ جس میں اختر بھی شامل تھا۔ بطور احتجاج میں راجدہ سے

بالکل نہ بولا۔ پہلے پہل تو وہ میری اس ناراضگی کو عارضی سمجھتے ہوئے مجھے بات بات پر چھیڑتی اور مذاق کرتی رہی لیکن جب میری خاموشی لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی گئی تو وہ پریشان سی نظر آنے لگی۔ باہر گلی میں عورتوں کے درمیان کچھ جھگڑا سا کھڑا ہو گیا اور عطی اور اختر جلدی سے کھڑکیوں کی طرف بھاگ اٹھیں۔ کیونکہ ایک عورت نے دوسری عورت کو بڑی لچھے دار گالی دے ڈالی تھی۔ راجدہ موقع پا کر میرے قریب آ گئی۔

"کیا ہو گیا ہے؟"

میں خاموش رہا۔

"کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معافی مانگتی ہوں۔"

"کچھ بھی نہیں ہوا۔۔۔۔۔۔۔" میں نے گرے گرانٹ کے انداز میں کہا۔ وہ فلم نٹوریس میں انگرڈ برگمین کو اسی انداز میں کہتا ہے۔ یہ فلم میں نے اسی روز ریگل میں دیکھی تھی۔ راجدہ اگر انگرڈ برگمین ہوتی تو اسے خاص انداز میں لمبی اور گداز بانہیں میرے گلے میں ڈال دیتی اور گرے گرانٹ کی ساری خفگی رفو چکر ہو جاتی۔ مگر اس بیچاری کو برگمین کے منانے کے انداز کی کیا خبر تھی۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے الٹا زیادہ پریشان ہو گئی۔ گلی والا جھگڑا ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور عطی اور اختر اندر آ رہی تھیں۔

"بڑی بدمعاش عورت ہے۔" اختر نے عطی سے کہا اور اس نے ہاں میں ہاں ملا دی۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ راجدہ اٹھی اور اوپر چلی گئی۔ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہاں اور بیٹھا رہا لیکن راجدہ بالکل نیچے نہ اتری۔ عطی آرام کرسی پر نیم دراز تقریباً سو رہی تھی۔ اختر کروشیا کاڑھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "راجدہ ناراض کیوں ہے؟"

اس نے کہا۔ "خود ہی پوچھ لو۔ اوپر ہو گی۔" اور مسکرانے لگی۔ میں ایک لفظ کہے بغیر اوپر چلا گیا۔

راجدہ درمیانی منزل میں پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے پکارا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "راجدہ' میں یہاں نہ آیا کروں؟" میں نے محسوس کیا کہ راجدہ کا جسم ہولے ہولے ہل رہا ہے۔

"اگر تم یہی چاہتی ہو تو خدا کی قسم میں اپنا آپ ہمیشہ کے لیے تم سے چھپا لوں گا۔"

راجدہ خاموش رہی۔ میں نے کندھے پکڑ کر راجدہ کا منہ اپنی طرف کر لیا۔ راجدہ رو رہی تھی۔ گھنی پلکوں کی خنک چھاؤں میں بارش کی جھڑی لگ رہی تھی۔ رم جھم رم جھم۔۔۔۔۔۔ اور سیاہ پتھروں کی چکنی سلوں پر سے پانی کے شفاف قطرے رک رک کر پھسل

رہے تھے۔

”روندے پتھر پہاڑاں دے“

چند لمحات کے لیے ہم خاموش نگاہوں سے ایک دوسرے کو تکتے رہے' بے زبان مسحور۔۔۔۔۔۔۔ جیسے ہمیں جادو کی چھڑی چھو گئی ہو۔ راجدہ کے آنسو نہیں تھمتے تھے۔ میں نے آہستہ سے راجدہ کی گرم پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

”میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا راجدہ' زندگی کے ہر دور میں تمہارے ساتھ رہوں گا' وعدہ کرتا ہوں۔“

اور جلدی سے اٹھ کر نیچے چلا آیا۔ نچلے کمرے میں عطی بدستور چھوٹا سامنہ لے کر سو رہی تھی اور اختر کروشیا کاڑھ رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

”پوچھ آئے کیا؟“

”بچپنا بہت ہے بھابھی!“ میں نے سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”چلے“ اختر نے آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

”اور کیا۔۔۔۔۔۔۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو راجدہ کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں بدستور سوجی ہوئی تھیں۔

راجدہ کے گھر میں داخل ہو کر' ایرانی قالین پر نیم دراز۔۔۔۔۔۔۔ محبت اور تسکین سے پر لمحات کے درمیان' کارنس کے اوپر ٹنگی ہوئی مشرقی تمدن کی تصویر کو گھورتے ہوئے میں نے کئی بار شیراز کے چھپتے ہوئے نیم روشن بازاروں اور ہرے بھرے شاداب باغوں اور پراسرار قہوہ خانوں کی سیر کی۔ قہوہ خانے جہاں ایران' مصر اور شام کی زہرہ جمال دوشیزائیں سوڈانی دف بجاتے ہوئے محو رقص تھیں' اور ہرے بھرے باغات کا پرسکوں سلسلہ' جہاں نازک اور خوبصورت روشوں کے ادھر ادھر جا بجا دلکش فوارے چاندی ایسا پانی اگل رہے تھے اور جہاں شیریں میووں سے لدے پھندے درخت تھے اور جن کے عقب میں نیلے افق پر شیراز کی مسجدوں اور خانقاہوں کے دودھیا گنبد۔۔۔۔۔۔۔

تنہائی اور خاموشی کے یہی وہ لمحات ہوا کرتے جب مجھے اندھیرے کی تہہ سے روشنی کے ننھے منے اتارے چھوٹتے دکھائی دیتے اور مجھے کوئی غیر مرئی شے روشنی کا دیا لیے تاریکی کے خوفناک سمندر کو چیرتی سربفلک لہروں میں کبھی ڈوبتی' کبھی ابھرتی آہستہ آہستہ قدم بہ قدم میری طرف بڑھتی معلوم ہوتی۔

تنہائی روشنی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ اور راجدہ کے تصور میں ڈوب کر میں اس روشنی سے کئی بار چندھیا گیا۔ راجدہ کا خیال مجھے سب سے الگ ہو جانے پر مجبور کر دیتا تھا اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ راجدہ کا تصور مثل ایک پل کے تھا' جو خاموشی اور تنہائی کی اتھاہ جھیل پر پھیلا ہوا تھا اور جسے عبور کرنے پر میں اپنے تئیں ایک انوکھی روشن اور ان دیکھی دنیا میں پاتا تھا۔ جہاں سوائے چمکیلے افق' دودھیا گنبدوں اور ابھرا ابھر کر ڈوبتی ہوئی لمبی لمبی سوگوار تانوں کے اور کچھ نہ تھا۔ سلسلہ در سلسلہ' وجدانی تاثرات میں ڈوبے ہوئے نوری لمحات کے منور ٹکڑے تھے جن کا راجدہ سے کوئی تعلق نہیں تھا اور جنہیں میں راجدہ سے الگ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نومبر ختم ہو رہا تھا۔ رات کو اچھی خنکی ہو گئی تھی۔ اور دن کو لوگ دھوپ اور چھاؤں کے سنگم پر چلتے تھے۔ ایک شام دفتر سے گھر لوٹتے ہوئے دل غیر معمولی طور پر اداس تھا۔ ایک تو راجدہ کو دیکھے ہفتہ ہو چلا تھا اور دوسرے کچھ فضا کا بھی اثر تھا۔ اپنی گلی میں پہنچتے ہی مجھے یونہی خیال آیا' اگر راجدہ گھر بیٹھی ہوئی ہو تو؟۔۔۔۔۔۔۔ تو پھر؟۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میں نے جھک ماری تھی۔ اور میں ہنسنے لگا۔ مگر گھر پہنچ کر جب راجدہ کو دیکھا تو میرا دل اچھل کر میرے منہ کے قریب آ گیا۔ کیا یہ جھک ماری گئی تھی یا خدا نے میری دعا قبول کی تھی یا راجدہ کی محبت نے مجھے گلی میں سوچنے پر مجبور کیا تھا؟

راجدہ باورچی خانے میں امی اور آپا کے درمیان بیٹھی تھی۔ اس کی پیشانی پر سونے کا چھوٹا سا جھومر' لیمپ اور جلتی ہوئی آگ کی روشنی میں جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل سا گیا۔ جیسے دھندلے رنگ کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا اچانک سورج کے سامنے آ گیا ہو۔ اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ گھر میں راجدہ کے ساتھ آیا ہوا کوئی محافظ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

“تم اکیلے کیسے آ گئیں؟”

“اکیلی تو نہیں آئی۔” بڑی آپا نے کہا۔ “خالہ کے لڑکے کے ساتھ اپنی خالہ سے ملنے آئی تھی اور۔۔۔۔۔۔۔”

راجدہ نے آپا کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا۔

“اور میں نے سوچا' آپا اور امی کو بھی مل آؤں۔” کس قدر شیریں تھا اس کا لہجہ' جیسے میٹھے پھلوں سے لدی ہوئی ڈالیوں پر بارش کے پہلے قطرے گر رہے ہوں۔

گلی میں ایک جگہ اس رات قوالی تھی۔ جس جگہ یہ محفل منعقد ہونے والی تھی اس کے عین اوپر آپا کی ایک سہیلی کا مکان تھا۔ بچے اور چھوٹی بہنیں تو سر شام ہی اس مکان میں پہنچ چکی تھیں۔ امی اور آپا وغیرہ میرے کھانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کھانے کے بعد میں نے

سیر کی تجویز پیش کر دی۔ آپا اور امی نے کہا۔ ”بھئی ہم تو نہیں جائیں گے تم دونوں ہو آؤ۔“ راجدہ بخوشی تیار ہو گئی۔

جب ہم دونوں نیچے اترنے لگے تو امی بولیں۔

”بھئی جلدی پلٹنا‘ راجدہ کو قوالی بھی سنانی ہے۔“

راجدہ اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔ ”فکر نہ کرو امی ۔۔۔۔۔۔ ہم ابھی آئے۔“

نیم روشن گلیوں اور بارونق بازاروں کو خاموشی سے عبور کر لینے پر جب ہم کمپنی باغ والی کھلی سڑک پر آ گئے تو میں نے راجدہ سے پوچھا۔

”یہ خالہ زاد بھائی کون ہے؟“

”بڑا اچھا لڑکا ہے ۔۔۔۔۔۔ سچ ۔۔۔۔۔۔ اسے ہماری محبت کا علم ہے۔ اس کی بھی ابھی ابھی شادی ہوئی ہے۔ وہ دونوں ہی ہماری طرح ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ دونوں نے شادی تک بڑے بڑے دکھ اٹھائے ہیں اسی لیے تو وہ مجھے خود یہاں تک چھوڑنے آیا تھا۔ شاید پرسوں مجھے لینے پھر آئے اور اس کی بیوی تو اس سے بھی زیادہ پیاری اور ہمدرد ہے۔“

”راجدہ! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ ہم اکیلے سیر کرنے جا رہے ہیں۔ کاش‘ کمپنی باغ کبھی نہ آئے۔“

اور راجدہ ہنس پڑی۔

”کمپنی باغ نہیں آئے گا تو پھر ہم سیر کہاں کریں گے؟“

اور کمپنی باغ آ گیا۔ جب ہم اس پلاٹ کے قریب سے گذرے جہاں سرخ روشوں پر گلابی اور زرد رنگ کے پھولوں کی بیلیں اپنا پرسکون سایہ کیے تھیں تو راجدہ بولی۔

”وہ شام یاد ہے نا؟“

”ہاں‘ راجدہ وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ ہماری محبت کی اولین شام تھی اور اس کا نقش بڑا گہرا اور دیرپا ہے۔ اسی شام ہماری محبت نے ان رنگ برنگ پھولوں اور پتوں کے درمیان اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ اس مرطوب سبزہ زار میں ۔۔۔۔۔۔ اور اسی جگہ میں نے پہلی مرتبہ تمہارے گرم پسینے کی خوشبو سونگھی تھی جس میں حنا کی خوشبو بھی شامل تھی۔“

”اخ“ راجدہ نے منہ سکیڑ کر کہا۔ ”کیسی باتیں کرتے ہو؟“

''تم نہیں جانتیں راجدہ' یہ میری اپنی باتیں ہیں۔ تم محض سنتی جاؤ۔ تمہیں کیا خبر میری محبت کسی وقت کہاں سے شروع ہو کہاں ختم ہوتی ہے۔ یہ بہار کے پھولوں کی مانند مجھے اپنے جسم کے ذرے ذرے سے پھوٹتی معلوم ہو رہی ہے اور میں نہیں جانتا ان پھولوں کا انجام کیا ہوگا؟''

راجدہ خاموشی سے میری باتیں سنتی گئی۔ ہم ایک ایسی سڑک پر سے گزر رہے تھے جس کی دونوں طرف جامن کے سایہ دار درخت تھے اور بجلی کے لیمپ کافی جگہ چھوڑ کر لگائے ہوئے تھے۔ چلتے ہوئے ہم کبھی اندھیرے میں گھر جاتے اور کبھی روشنی میں نکل آتے۔ ہوا کے نرم جھونکے ہمارے قریب سے کبھی رات کی رانی اور کبھی چنبیلی اور گلاب کی خوشبو لیے گذر جاتے اب فضا میں خنکی بڑھنے لگی تھی۔

''راجدہ سردی تو نہیں لگ رہی؟''

''بالکل نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ آج تو میرے ہاتھ بھی گرم ہیں۔''

''یہ محبت کی گرمی ہے راجدہ۔'' میں نے اس کا نرم اور نیم گرم ہاتھ دبا کر کہا اور راجدہ مسکرانے لگے۔

ہم پھر اندھیرے کے غار میں سے گذر رہے تھے۔ مگر راجدہ کے سنہری جھومر کی چمک یہاں اور تیز ہو گئی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور ایک کلب گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے ہمیں مردوں کے قہقہوں اور بلیرڈ کی چھڑی کے گیند سے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دیں۔

گنبد والے ریڈیو پر اردو کے بعد انگریزی کی خبریں سنائی جا رہی تھیں اور پلاٹ کے بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگ اٹھنا شروع ہو گئے تھے۔ بہار کی چمکیلی رات کے گہرے نیلے آسمان پر ستاروں کی کافوری فانوس جا بجا روشن تھے۔ ایک طرف سات ستاروں کی ٹولی سفیدے کے چھریرے درختوں پر سے جھانک رہی تھی۔ شبنم آلود گھاس پر سے گذر کر ہم اپنے پسندیدہ پلاٹ کے وسط میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہ جگہ پلاٹ کی عام سطح سے نیچی تھی اور حوض کی مانند بنی ہوئی تھی۔ ہمارے دائیں بائیں نصف دائرے کی شکل میں پھولوں بھرے پودوں کی کیاریاں تھیں جن میں قرمزی' نیم گلابی' گہرے زرد اور برف ایسے سفید کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے بے شمار پھول اوس میں بھیگے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی نہر کی طرف سے کناروں پر اگی ہوئی بھنگ کی تیز اور مرطوب بو بھی آ جاتی تھی۔ سامنے والے باغ میں آڑو اور آلوچے کے درخت قطار اندر قطار' سفید شگوفوں سے لدے ہوئے تھے۔ کلب گھروں کے روشن دانوں میں زرد زرد روشنی جھانک رہی تھی۔ دفعتاً نہر والے درختوں کے عقب میں مدھم روشنی کا ایک غبار سا اٹھا جو لمحہ بہ لمحہ پھیلتا گیا اور تھوڑی ہی دیر

بعد درختوں کے اوپر زرد چاند کا پژمردہ چہرہ نمودار ہوگیا۔ اس کی سوگوار چمک میں باغ کی ہر شے افسردہ اور ملول سی نظر آنے لگی۔ ادھر ادھر پھلدار باغات کے ذخیروں میں پرندوں کی پیاری پیاری آوازیں بلند ہونے لگیں۔ جیسے وہ چاند کے استقبال کا گیت گا رہے ہوں۔ راجدہ سیاہ برقعے میں اپنا آپ لپیٹے مرمریں بنچ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا سر میرے زانو پر تھا اور میری انگلیاں اس کے سنہری جھومر سے کھیل رہی تھیں۔ جو دھندلی چاندنی میں، شام کے ستارے کی مانند کبھی سرخ چمک دے رہا تھا اور کبھی زرد۔ راجدہ نے میری طرف آنکھیں اٹھا کر کہا۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔۔کہیں تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہیں دو گے؟“

”کبھی نہیں راجدہ۔“

”سچ میں اس وقت مر جاؤں گی۔“

”او۔۔۔۔۔۔کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ۔“ اور میں نے شام کے ستارے کو چوم لیا اور پھر راجدہ کے نرم بالوں سے کھیلتے کھیلتے راجدہ سے بے خبر میں اپنی تنہائی اور خاموشیوں کے گہرے سمندروں کی نچلی تہوں میں اتر گیا اور وہاں میں نے سیاہ پتھروں کی درزوں میں ایسے انمول موتیوں کی ڈھیریاں دیکھیں جو دنیا کی کسی کان میں نہ تھیں اور چکیلی بیلوں پر جھومتے ہوئے ایسے پھول دیکھے جو دنیا کے کسی باغ میں نہ تھے۔

ہم پلاٹ سے نکل کر سڑک پر آئے تو ہال دروازے والی گھڑی نے رات کے گیارہ کا گجر بجایا۔ اب ٹھنڈی ہوا سارے باغ میں چل رہی تھی اور چاند کافی اوپر آ گیا تھا۔ ہمارے سامنے سڑکوں پر دور دور تک درختوں کے جھومتے ہوئے سایوں کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ ہمارے کپڑے اوس میں نم آلود تھے۔ راجدہ کا سیاہ نقاب ہوا میں لہرا رہا تھا اور وہ خود یوں چل رہی تھی جیسے ابھی ہلکی شراب کا ایک پیگ لگا کر اٹھی ہو۔

جس وقت ہم اپنی گلی میں پہنچے تو قوالی ہو رہی تھی۔

راجدہ کو بڑی آپا اور امی کے پاس پہنچانے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا اور اپنے دوستوں کی ٹولی میں جا بیٹھا۔ ابھی میں پہلا کش لگا رہا تھا کہ خوبصورت قوال نے مجھے نیم وا نگاہوں سے دیکھ کر مصرعہ اٹھایا۔

سہانی رات تھی اور پرسکوں زمانہ تھا

معاً مجھے محسوس ہوا کہ وہ میری اور راجدہ کی ملاقات کا حال بیان کرنے لگا ہے جیسے وہ ابھی کہے گا۔ سہانی رات تھی اور پرسکوں زمانہ تھا اور راجدہ اپنا سر اپنے محبوب کے زانو پر رکھے کمپنی باغ کے پلاٹ میں لیٹی ہوئی تھی وہ دونوں ابھی ابھی کمپنی باغ سے واپس آئے ہیں۔ راجدہ اوپر چلی گئی ہے اور اس کا محبوب وہ سامنے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ میں گھبرا سا گیا۔ مگر خیریت گزری۔ دوسرا مصرعہ کچھ اور تھا۔

صبح نہایت روشن اور شاندار تھی۔ نیلے اور پرنور آسمان پر سپید سپید کبوتروں کی ٹولیاں چکر لگا رہی تھیں۔ راجدہ دیر تک سوئی رہی۔ اس دوران میں، میں صبح کی سیر سے واپس آ چکا تھا اور میرے ہاتھ میں اصلی گلاب کے شبنم آلود سرخ پھول تھے۔ جن سے بڑی فرحت بخش شیریں خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں دبے پاؤں راجدہ کی طرف گیا۔ وہ گرم چادر میں منہ سر لپیٹے بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے آہستہ سے چادر کھسکائی اور پھول اس کے منہ پر ڈال دیئے اور تیزی سے باہر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھولوں کا گلدستہ پکڑے، نیند میں شرابور نیم وا آنکھیں لئے، رومال سے منہ پر پڑی ہوئی شبنم پونچھتی باورچی خانے میں داخل ہوئی جیسے وہ بہار کی دیوی ہو اور اپنے عہد محبت کی نشانی لیے خیابانوں سے رخصت ہو رہی ہو۔

''پھولوں کی شہزادی'' چھوٹے بھائی نے کہا۔ وہ پچھلے روز اسی نام کی ایک کتاب سکول سے لایا تھا۔

امی، بڑی آپا اور چھوٹی بہنیں مسکرا پڑیں۔ اور چھوٹا بھائی اور راجدہ شرما گئے۔ باورچی خانہ کافی کھلا اور روشن تھا اور موسم سرما کی بھی آمد تھی۔ چنانچہ صبح کی چائے یہیں اڑا کرتی تھی۔

''بھئی خواہ کچھ ہو میں تو راجدہ کو اپنے پاس ہی لے آؤں گی۔'' امی نے راجدہ کے پیالے میں بالائی ڈالتے ہوئے کہا۔ راجدہ نے سر جھکا لیا۔ آپا بولیں۔

''کیوں نہیں، اور اس سے زیادہ اچھی بھابی ہمیں کہاں ملے گی؟''

اور راجدہ نے شرما کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ اس کی مخروطی انگلیوں میں سنہری انگوٹھیوں کے سفید نگینے آگ کی روشنی میں دمک اٹھے اور پھر جیسے باورچی خانہ حجلۂ عروسی میں بدل گیا اور ایک نیم روشن خوشبوؤں بھرے کمرے میں سیج پر چنبیلی اور موتیا کے بے شمار پھول بکھر گئے۔ راجدہ دلہن کا عروسی جوڑا پہنے، سنہری جھومر پیشانی پر لگائے، سولہ سنگھار سے آراستہ ہو کر سیج پر چھوئی موئی بن کر بیٹھ گئی اور میں سیج کے قریب آیا اور راجدہ نے جلدی سے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور اس کی حنا میں بھگوئی ہوئی مخروطی انگلیوں میں انگوٹھیوں کے نگینے ستاروں کی مانند دمکنے لگے اور امی نے کہا۔

’’پر یہ کہیں ٹک کر بھی کام کرے۔‘‘ امی کا یہ جملہ ساکن جھیل میں پھینکا ہوا پتھر تھا۔ جو میرے سنہری خواب کی لہروں کو مجھ سے دور لے گیا اور میں پھر باورچی خانے میں تھا۔ امی میری پیالی میں چائے ڈال رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں، راجدہ اور بڑی آپا دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ آپا گلی والی کھڑکی کی چق کے قریب بیٹھی سویٹر بن رہی تھی اور راجدہ میری میز کے قریب آرام کرسی پر نیم چہرے کو تکنے لگتا تھا۔ جہاں اختر شیرانی کی نظموں کا مطالعہ ایک دلفریب حسن پیدا کر رہا تھا۔ بڑی آپا بولیں۔

’’چلو راجدہ۔۔۔۔۔۔۔فہمیدہ سے مل آئیں۔‘‘

فہمیدہ بڑی آپا کی گہری سہیلی تھی۔ ان کا مکان گلی میں ہی تھا اور اس نے راجدہ کو آ کر مل جانے کا پیغام بھیجا تھا۔ راجدہ تیار ہو گئی اور میں نے قلم میز پر رکھ دیا۔

’’جلدی لوٹ آؤں گی۔‘‘ راجدہ نے برقع پہنتے ہوئے کہا۔ میں نے دراز سے موم بتی نکالی اور اسے روشن کر کے میز پر لگا دیا۔

’’اسے بجھنے مت دینا۔‘‘ راجدہ ہنس پڑی۔

’’یہ تو آدھی بھی ختم نہ ہو گی کہ میں آ جاؤں گی۔‘‘ اور وہ روشن موم بتی کو دیکھ کر جس تیزی سے آپا کے ہمراہ چق اٹھا باہر نکلی۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا وہ فہمیدہ کے مکان کو ہاتھ لگا کر واپس آ جائے گی اور مجھے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا جب بڑی آپا مجھے بازار سے کوئی شے خرید لانے کے لیے بھیجنے لگتیں تو وہ زمین پر تھوک کر کہتیں۔

’’دیکھتی ہوں کہ یہ پہلے سوکھتی ہے کہ تم پہلے آتے ہو۔‘‘

اور میں لپک کر دوکاندار کے پاس پہنچتا۔ جلدی جلدی سودا خریدتا اور گھر میں داخل ہو کر سب سے پہلے تھوک کو دیکھتا کہ کہیں وہ سوکھ تو نہیں گئی۔ حالانکہ بڑی آپا اسے بالکل بھول گئی ہوتی تھیں۔

میز کے کنارے پر لگی ہوئے موم بتی لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی تھی۔ گرم موم کے ننھے منے شفاف قطرے دلہن کے آنسوؤں کی مانند بہہ رہے تھے۔ سگریٹ سلگائے میں بڑے پیار سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرا سگریٹ بھی موم بتی کے ساتھ ہی سلگ رہا تھا۔ سگریٹ میں سے نیلے دھوئیں کی دبلی پتلی لکیر اٹھ رہی تھی اور موم بتی میں سے ننھا سا شعلہ۔۔۔۔۔۔۔ایک کے پاس دھواں اور راکھ تھی اور دوسرے کے پاس روشنی اور آنسو۔۔۔۔۔۔۔موم بتی قریب الختم تھی۔ میں یوں مضطرب اور پریشان تھا جیسے اگر موم بتی بجھ گئی تو پھر راجدہ کبھی میرے پاس نہ آئے گی اور میں اس کے رخساروں کے محرابی خم نہ دیکھ سکوں گا۔

موم بتی کا زرد شعلہ بھڑکا اور ڈوب سا گیا۔ جس طرح میدان جنگ میں ڈھلتی دھوپ کی سرخی میں کسی سپاہی کے بلند ہوتے ہوئے نیزے کی انی ایک دفعہ چمک کر بجھ جائے اور موم بتی بجھ گئی اور راجدہ نہ آئی۔ میں نے سگریٹ کی گردن راکھ دان میں مسل کر پرانی موم بتی کی لاش پر نئی موم بتی روشن کی اور سگریٹ سلگا کر بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد گلی کے دروازے کی چق اٹھی اور راجدہ جلدی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کا سانس تیز چل رہا تھا جیسے وہ بھاگتی آ رہی ہو۔

"ابھی نہیں بجھی؟ دیکھا، میں کتنی جلدی آ گئی۔"

میں نے راجدہ کو ایک لمحے کے لیے دیکھا اور چپکے سے سر جھکا لیا۔ وہ برقعے کے بٹن کھولتی ہوئی میری طرف بڑھی۔

"چپ کیوں ہو گئے ہو؟"

"کچھ نہیں ــــــــ یہ دوسری موم بتی ہے، پہلی بجھ گئی تھی۔"

"تو اپنی موم بتی کے پیسے لے لو۔"

یہ اس نے کچھ ایسے پیارے انداز سے کہا کہ ہم اپنی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے۔ "سچ بڑے اچھے لوگ ہیں وہ ــــــــ مجھے اٹھنے ہی نہ دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے بھاگ کر آئی ہوں۔ آپا کہنے لگی، میں ذرا دیر بعد آؤں گی۔ میں نے کہا، بھئی میں تو چلتی ہوں۔"

اس دوران راجدہ نقاب ایک طرف رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ موم بتی کی نرم روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش بڑی خوبصورتی سے اجاگر ہو رہے تھے۔ اس کا چہرہ سنہری جلد والی ایک کتاب تھا جو محبت بھرے روشن اور مقدس اشعار سے لبریز ہو۔

موم بتی کی دھیمی روشنی میں ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہماری آوازیں ایک دوسری سے ہم آہنگ تھیں۔ ان لہروں کی مانند جو پر اسرار چاندنی میں بڑی خاموشی سے پرسکوں ساحلوں کی طرف سمٹ آتی ہیں۔

ایک ہی چشمے سے نکلی ہوئی دو ندیاں، جو پہاڑی کی مرطوب نچان میں جا کر آپس میں مل کر بہنے لگی ہوں، ایک ہی ڈالی کے دو شگوفے، جو ایک ساتھ کھلیں اور جنہیں ایک ساتھ مرجھا کر جھڑ جانا ہو۔

ہم الفاظ کی موسیقی سے کھیل رہے تھے۔ جس طرح موسم بہار میں کم سن بچے پھولوں سے کھیلتے ہیں۔ راجدہ کے چہرے کے گرد روشنی کا پر نور ہالہ سا تھا اور مجھے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے راجدہ آگ کا ایک زریں شعلہ ہے جو شام کے وقت کسی کھلے میدان کے وسط میں روشن ہے۔

جب ہم خاموش ہو جاتے تو ہمیں اپنے کہے سنے الفاظ دیوان خانے کی نی روشن فضا میں جگنوؤں کی مانند رہ رہ کر چمکتے دکھائی دیتے۔ پھر ہماری گفتگو خاموش اور بے زبان گفتگو میں بدل جاتی۔ ہم ایک دوسرے سے درختوں' پھولوں' ستاروں اور آبشاروں کی باتیں کرتے۔

یہ گھنے جنگلات اور تاریک راتوں کی گفتگو تھی جو دن نکلنے پر اپنے پیچھے روشنی اور شبنم کے آنسو چھوڑ جاتی ہے۔ پھر دن نکل آیا اور راجدہ لاہور چلی گئی۔

لاہور پہنچنے کے بعد راجدہ مجھے برابر خط لکھتی رہی۔

جنوری کا اخیر تھا کہ راجدہ کا خط آیا۔

"میرے پردیسی ۔۔۔۔۔۔ معاف کرنا میں تمہارے خط کا جواب دیر سے لکھ رہی ہوں۔ میرا چچازاد بھائی سعید برما سے اچانک واپس آ گیا ہے اور گھر میں چونکہ رشتہ داروں کی آمدورفت رہی' اس لیے اتنی فرصت نہ مل سکی کہ تمہیں اطمینان سے بیٹھ کر خط لکھتی۔ سچ' مجھے بڑا افسوس ہے ۔۔۔۔۔۔۔ پتہ نہیں تم کیا خیال کرتے ہو گے۔"

راجدہ کا انداز درست تھا۔ سعید کے بارے میں مجھے طرح طرح کے غیر خوشگوار خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ اگرچہ اس کے متعلق میں اتنا ہی جانتا تھا کہ راجدہ کا چچازاد بھائی ہے اور تین سال سے برما میں ہے' پھر بھی میرے کان میں اتنی بھنک ضرور پڑ چکی تھی کہ سعید کی مرحوم ماں راجدہ کو اپنے بیٹے کے لیے مانگ چکی ہے۔ اب مجھے بار بار سعید کا خیال آتا اور ہر بار مجھے یہی محسوس ہوتا جیسے کوئی ان دیکھا ہاتھ بڑی خاموشی سے میرے دل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں نے خیال ہی خیال میں کئی دفعہ راجدہ کو سعید کے پاس بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا۔

اور ایک ہفتہ بعد جب میں راجدہ کے ہاں گیا تو راجدہ تولیہ اور صابن دانی پکڑے سعید کا منہ دھلا رہی تھی۔ مجھے اچانک اپنے بالمقابل دیکھ کر راجدہ کا چہرہ ایک دفعہ زرد ہو کر جیسے ڈوب سا گیا۔ راجدہ کے بھائی وہیں بیٹھے تھے۔ بعد ازاں میرا تعارف کرایا گیا۔ سعید خندہ پیشانی سے ملا۔ راجدہ اوپر جا چکی تھی۔ سعید ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ راجدہ کے بھائی کیرم بورڈ کھیل رہے تھے اور میں آرام کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پی رہا تھا۔ عطی اور اختر وغیرہ باورچی خانے میں تھیں۔ کبھی کبھی عطی کی دبی دبی ہنسی اور اختر کی گفتگو کی مدھم آواز آ جاتی تھی۔ راجدہ اوپر تھی اور میں کمرے میں خاموش اور اداس اداس بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں وہاں کتنی دیر بیٹھا رہا مگر راجدہ ایک بار بھی میرے سامنے نہیں آئی۔

اس گھر میں سالوں کی گرویدگی اور محبت کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے وہاں کی ہر شے بے رخی سے منہ پھیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے میں اجنبی ہوں اور ان کے منشا کے خلاف وہاں آن بیٹھا ہوں۔

مجھے اپنا جسم خود اپنے آپ پر ایک نا قابل برداشت بوجھ معلوم ہونے لگا۔

میں اٹھا اور چپکے سے راجدہ کے گھر سے باہر نکل آیا۔

باہر لوگ آ رہے تھے اور جا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ کئی ایک نے میری طرف حیرانی اور دلچسپی سے دیکھا جیسے میں کوئی بہروپیا ہوں اور بھیس بدل کر ان کے درمیان آ گیا ہوں۔ بازار میں چلتے چلتے کئی بار میرے قدم لڑکھڑائے اور میں گرتے گرتے سنبھلا۔ ایک ہوٹل کے قریب پہنچ کر میں اندر گھس گیا لیکن چائے کا آرڈر دے کر بغیر چائے پیئے باہر نکل آیا۔

میری حالت کسی ایسے گویے کی سی تھی جو بھری محفل میں گاتے ہوئے اچانک بے سرا ہو گیا ہو۔

میں امرتسر چلا آیا۔ اپنے دیوان خانے میں پہنچ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بیچ بازار میں ننگا ہو گیا تھا اور میرے اوپر کسی نے چادر ڈال دی ہے۔ میز پر پڑی ہوئی کتابوں کے پاس پھولدان میں گلاب کے پھول مرجھا رہے تھے۔ کونے میں میرے چھوٹے بھائی کے ہاتھ کی بنی ہوئی آئل پینٹ تصویر پر گرد سی جم رہی تھی۔ اس تصویر میں سوکھے ہوئے درختوں کی بے برگ ٹہنیوں کے عقب میں بھورے رنگ کے جل تھل کرنے والے بادل اٹھتے دکھائے گئے تھے اور نیچے لکھا تھا۔

"ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا"

میں نے اس تصویر کو لے کر رومال سے اس پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور میرا دل بھر آیا اور میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" اور میں نے تصویر کو سینے سے لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک راجدہ کا غم آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتا رہا اور جب میں نے تصویر کو دوبارہ میز پر رکھا تو مجھے اپنا آپ اس بچے کی مانند مسرور اور ہلکا ہلکا محسوس ہو رہا تھا جسے سکول کے دروازے پر پہنچ کر خبر ملے آج چھٹی ہے۔

دوسرے مہینے کے وسط میں راجدہ کا خط آیا کہ اس کے والدین اس کی شادی سعید سے کرنا چاہتے ہیں اور اس نے زہر منگوا کر اپنے پاس رکھ لیا ہے۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

راجدہ کا ایک اور خط آیا۔

“۔۔۔۔۔۔ خدا کے لیے مجھے بچاؤ' میں مرجاؤں گی پردیسی۔۔۔۔۔۔”

میں کیا کرتا۔۔۔۔۔۔ میں نوکری چھوڑ بیٹھا تھا۔ کس برتے پر راجدہ کو بچاتا۔ میں نے امی سے بات کی کہ اگر راجدہ مجھے مل جائے تو میں نوکری پھر کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ مان گئیں مگر ابا نے کہا کہ وہ لڑکی والوں کو صاف صاف کہہ دیں گے کہ لڑکا نکما ہے۔ راجدہ مجھے برابر لکھتی' نوکری کر لو پھر ہم شادی کر لیں گے۔ پھر ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکے گی۔ میں نے سرتوڑ کوشش کی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ جب راجدہ کے بچھڑ جانے کے بعد مجھے ایک کالج لائبریری میں پچاس روپوں کی جگہ مل گئی۔ اس رات خوشی سے میں بالکل سو نہ سکا۔ تمام رات بستر میں لیٹا بیداری کے خواب دیکھتا رہا۔ راجدہ بھاری کامدار ریشمی لباس میں ملبوس پھولوں میں بسی دلہن بنی میرے ساتھ سمٹی ہوئی بیٹھی ہے۔ باریک ریشمی گھونگھٹ میں سے مجھے اس کے ریشمی رخسار دمکتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔ ہمیں راجدہ کی شریر اور چنچل سہیلیوں نے گھیر رکھا ہے۔ کوئی پان پیش کر رہی ہے اور کوئی دودھ کا گلاس پلانے پر تلی کھڑی ہے۔ مگر میں انکار کر رہا ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ پان سپاریوں کی جگہ روڑے اور دودھ میں چینی کی جگہ نمک کا ڈبہ انڈیل دیا گیا ہے۔ پھر میں نیچے جانے کے لیے اٹھا ہوں اور میرے ساتھ تکیہ بھی اٹھ آیا ہے' کیونکہ اسے میرے کوٹ کے ساتھ چپکے سے چمٹا دیا گیا ہے۔ میرا مذاق اڑایا جا رہا ہے اور میں شرمندہ ہو رہا ہوں۔ میں جوتا ڈھونڈ رہا ہوں اور جوتا نہیں مل رہا۔

پھر جیسے کمپنی باغ میں بھری بیلوں اور گنجان درختوں کی پرسکون چھاؤں میں راجدہ میرے قریب بیٹھی اون اور سلائیاں لیے کچھ بن رہی ہے۔ میں گھاس پر نیم دراز ہوں۔ ہمارے پاس ہی ایک بڑی پیاری بچی پھولوں اور گھاس پر گرے پتوں سے کھیل رہی ہے۔ میں کبھی راجدہ اور کبھی بچی کی طرف دیکھ رہا ہوں اور آسمان پر موسم بہار کی شام کی سنہری چمک پھیل رہی ہے۔

اور پھر دن نکل آیا اور اسی دن میں امیدوں اور ارادوں سے بھرپور دل لیے راجدہ سے ملنے گیا۔ ایک بازار کا موڑ کاٹتے ہی مجھے راجدہ کا بھائی آتا نظر آیا۔ مجھے یوں معلوم ہوا جیسے راجدہ خود چلی آ رہی ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں اسے گلے سے لگا لوں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔

“بھئی کل شام دفتر سے ضرور گھر پہنچ جانا۔”

“کوئی محفل سرود گرم ہو رہی ہے کیا؟” میں نے اپنے جسم میں مسرتوں کے غبارے سے ابھرتے محسوس کئے۔

“یہ سمجھ لو۔” اس نے حسب عادت مسکراتے ہوئے کہا۔ “سعید کا نکاح ہو رہا ہے۔”

“کہاں؟” میرے منہ سے خود بخود ہی نکل گیا لیکن مجھے اب تک یاد نہیں میں نے ایسا کہا ہو۔

''گھر ہی میں۔۔۔۔۔۔۔ویسے تم ضرور پہنچ جانا۔''

''ضرور۔۔۔۔۔۔۔''

اور وہ چلا گیا۔ اور مسرتوں کے غبارے یکے بعد دیگرے پھٹتے چلے گئے اور میں نہ راجدہ کے گھر کی سمت بڑھ سکا اور نہ وہاں کھڑا ہو سکا۔ بازار میں ہر شے سے بے خبر' میں سر جھکائے' ہاتھ لٹکائے یوں چلا جا رہا تھا جیسے اپنے جوان بھائی کو قبرستان میں دفنا کر آیا ہوں۔

راجدہ سعید سے بیاہی جا رہی تھی۔

وحشی اور ظالم لوگوں سے بھری ہوئی ریل گاڑی سے نکل کر میں نے نرم دل گارڈ کے ڈبے میں پناہ لی تھی اور نرم دل گارڈ نے مجھے بڑی محبت سے سگریٹ پیش کرنے کے بعد مجھے ڈبے سے باہر نکال دیا تھا اور میں پھر انہی لوگوں کے اژدھام میں تھا۔ تنہا اور بے یار و مددگار۔

گھر پہنچ کر میں تمام رات سگریٹ پیتا اور بڑے تحمل سے راجدہ کے بغیر بسر ہونے والی اپنی زندگی کے نشیب و فراز گنتا رہا۔ راجدہ کے بغیر میں اپنی زندگی کا کوئی آخری نقشہ قائم کرنے سے بالکل قاصر تھا۔

کسی وقت مجھے محسوس ہوتا کہ میں کسی اجنبی اور ناواقف شہر کے ان دیکھے بازاروں میں یونہی آوارہ اور بے مقصد گھوم رہا ہوں اور لوگ اپنی اپنی دکانیں اور کاروبار بند کر کے گھروں کی طرف جا رہے ہیں اور کبھی مجھے اپنی دونوں طرف ویران اور اجاڑ کھنڈرات کا مہیب سلسلہ حد نگاہ تک پھیلا معلوم ہوتا اور میں چلا جا رہا ہوں۔ کہاں؟ کدھر؟۔۔۔۔۔۔۔کوئی خبر نہیں۔

راجدہ میرے لیے روشنی کا مینار تھی جسے دیکھ کر بھولے بھٹکے جہاز ران راستے کی درست سمت اور خطرے سے آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر اب اس مینار کی روشنی دھند کے دبیز غلاف میں لپٹی ہوئی تھی اور مجھے ہر قدم پر خطرے اور گمراہی کا احساس ہو رہا تھا۔ راجدہ کو اپنے قریب پا کر مجھے اپنے تئیں ایک ایسے پہاڑ کا احساس ہوتا جس کی چوٹی پر سورج طلوع ہو رہا ہو لیکن اب یہ سورج غروب ہو رہا تھا اور میرے دامن کی بستیوں میں شام کے تاریک سائے پھیل رہے تھے۔

راجدہ کا خیال مجھے ہر شے سے الگ تھلگ ہونے پر اکساتا تھا اور سب سے الگ ہو کر میں کئی بار راجدہ کے خیال سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ مگر آج ناامیدی اور خاموشی کے اس پل پر میں اکیلا کھڑا' اپنے نیچے بہنے والی تنہائی اور درد کی تاریک خلیج کو تک رہا تھا۔ جہاں راجدہ کی کانپتی ہوئی مدھم صورت سرمئی دھندلکوں میں آہستہ آہستہ تحلیل ہو رہی تھی۔

شام کے وقت میں گھر سے نکلا اور کمپنی باغ کی طرف چل پڑا۔

باغ میں دھوپ ماند پڑ رہی تھی۔ کہیں کہیں ڈھلتے سورج کی سرخی درختوں کے تنوں پر چمک رہی تھی۔ ہلکی سرد ہوا میں درختوں پر سے سوکھے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے۔ سڑک پر گرتے ہی وہ کچھ دیر تک لڑھکتے اور پھر جیسے بے جان سے ہو کر رہ جاتے۔

پردہ کلب کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے راجدہ، عطی اور بھانجی اور بچوں کی آوازیں سنائی دیں۔ جیسے وہ اندر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ پلاٹ کے وسط والا آم کا گنجان درخت خاموش محافظ کی مانند کھڑا تھا اور زرد زرد گھاس پر خالی ڈبیاں اور چوسی ہوئی گنڈیریوں کے چھلکے بکھرے ہوئے تھے۔

سڑک پر گرے ہوئے سوکھے پتوں کو روندتا، میں اس پلاٹ میں داخل ہوا جہاں ہماری محبت نے پہلی بار رنگ برنگ پھولوں اور پتوں میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ یہاں مرجھائے ہوئے پھول پودوں کی قطاریں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ چھت والے گلاب کی بیلیں سوکھ رہی تھیں۔

”راجدہ دیکھ کر چلنا کہیں کانٹا نہ چبھ جائے۔“ یہ بھانجی کی آواز تھی۔

”اوئی پانی بڑا ٹھنڈا ہے۔ تم بھی آ جاؤ۔“ یہ راجدہ کی آواز تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ساٹن کی شلوار کے پائنچے اٹھائے پلاٹ کے پانی میں چل رہی تھی۔

اب وہ میرے قریب کھڑی سینڈل کے تسمے باندھ رہی ہے اور فضا میں اس کے خوشگوار پسینے اور حنا کی خوشبو پھیل رہی ہے اور وہ بھانجی سے کہہ رہی ہے۔ ”سچ میں تو ایسی راتیں باغوں میں ہی گزارنا چاہتی ہوں، بس پائنچے اٹھائے پانی میں گھومتی پھرتی رہوں اور جب تھک جاؤں تو۔۔۔۔۔۔۔“

ہم کرسٹل میں آ گئے ہیں اور راجدہ کیبن کے شیشوں میں سے مجھے پہلی بار محبت کی پاک اور بے لوث نظروں سے تک رہی ہے۔

اور راجدہ نے نقاب اٹھا لیا ہے۔ کالے نقاب میں اس کا سپید چہرہ۔۔۔۔۔۔۔ جیسے تاریک رات میں کسی خانقاہ کا کھلا ہوا روشن طاق۔۔۔۔۔۔۔

راجدہ کہہ رہی ہے۔

”میں ڈرتی ہوں۔ تم مجھ سے محبت کرنا چھوڑ تو نہ دو گے؟ سچ میں مر جاؤں گی۔“

”او۔۔۔۔۔۔۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں راجدہ۔“

اور میں غم سے نڈھال سا ہو کر سنگین بنچ پر بیٹھ گیا۔ میرے اوپر گلاب کی پژمردہ بیل کی جھاڑ تھے۔ میں نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا اور راجدہ۔۔۔۔۔۔۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔ اور پھر رم جھم، رم جھم۔۔۔۔۔۔۔ مدھم بارش کی غمگین موسیقی اور سیاہ پتھروں پر سے رک رک کر ٹھہر ٹھہر کا پھسلتے ہوئے پتھروں کے آنسو۔۔۔۔۔۔

’’روندے پتھر پہاڑاں دے‘‘

میں پلاٹ سے باہر نکلا تو سرد اور نیلے آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے۔ ہوا تھم گئی تھی اور باغ کے گنجان درخت یوں خاموش اور متفکر کھڑے تھے جیسے وہ بے زبان فرشتے ہوں اور راہ میں کھڑے کسی پیغمبر کے جنازے کا انتظار کر رہے ہوں۔

وقت کا نہ رکنے والا چکر گھومتا گیا۔

میں نے راجدہ کے ہاں آنا جانا چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ تک راجدہ کے دکھ بھرے خط مجھے ملتے رہے لیکن میری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے بھی خط لکھنا بند کر دیے۔ میرا زیادہ وقت لائبریری میں گزرتا تھا۔ دنیا کے بہترین مصنفوں کی کتابوں نے میرے دل و دماغ کو روشنی اور سکون عطا کیا۔

قسم قسم کی تصانیف سے بھری ہوئی لمبی لمبی الماریوں کے پاس فاؤسٹ، جین ایر، سلامبو اور پیام مشرق پڑھتے پڑھتے جب کبھی مجھ راجدہ کا خیال آتا تو میں اپنے آپ سے شرمسار سا ہو جاتا جیسے وہ کوئی لڑائی مار کٹائی والی فلم ہو جسے میں نے کبھی بڑے شوق سے دیکھا ہو۔ پھر بھی کسی وقت جب بارش موسلا دھار ہو رہی ہوتی تو میں لائبریری کی بالکونی میں کھڑا نیچے کالج کے پلاٹ میں ننگے بنچوں، سرسبز گھاس اور عشق پیچاں کے کاسنی پھولوں کو دیکھتے دیکھتے محسوس کرتا جیسے راجدہ مجھ سے جدا نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی میرے قریب اس بالکونی میں کھڑی، گرتی بارش میں پلاٹ کا نظارہ کر رہی ہے اور پھر میرا دل راجدہ کی محبت کے غیر فانی جذبات سے مالا مال ہو جاتا۔

انہی لمحات میں، مجھے اپنے ارد گرد ننھی اور کم سن پریوں کے نازک پروں کی نرم پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی اور میرے دل کے بھی جیسے پر نکل آتے اور وہ بھی ان معصوم آسمانی روحوں کے جھرمٹ میں مل کر مصروف پرواز ہو جاتا۔

جنوری کی ابر آلود شام کو۔۔۔۔۔۔۔ جبکہ سردی اپنے جوبن پر تھی۔

میں لائبریری سے باہر نکل رہا تھا کہ راجدہ کا بھائی مل گیا۔ گرم سوٹ میں ملبوس، سگریٹ سلگائے، اس نے گرم جوشی سے میری طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا۔

''کہاں رہتے ہو؟ کبھی ملے ہی نہیں۔ بھئی کوئی غلطی ہو تو۔۔۔۔۔۔۔''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا' وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اس کے قہقہے کا انداز راجدہ سے کس قدر ملتا تھا۔ ایک پل کے لیے میں کائنات کی ہر شے سے الگ ہو کر راجدہ کے خیال میں کھو گیا۔

ہم ایک قریبی چائے خانے میں داخل ہو گئے۔ یہاں کی فضا ہر قسم کے لوگوں اور سگرٹوں کے دھوئیں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم نے چائے منگوائی اور کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب ہم ہوٹل سے باہر نکلے تو مدھم مدھم لیمپوں کی بھیگی ہوئی روشنی میں گیلی سڑک پر جا بجا پانی کی گڑھے چمک رہے تھے اور لوگ لمبے لمبے کوٹوں اور گرم چادروں میں منہ سر چھپائے جلدی جلدی گزر رہے تھے۔ معلوم ہوا بارش ایک دفعہ ہو کر ہٹی ہے۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ ابھی بمشکل ایک بازار ہی طے کیا ہو گا پھر بوندا باندی شروع ہو گئی اور جب راجدہ کے گھر والی گلی قریب آئی تو بارش یکلخت تیز ہو گئی۔ ہم لپک کر گلی میں گھسے اور ایک مکان کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو گئے۔ بارش چھپر پھاڑ کر شروع ہو گئی تھی۔ ہم رومالوں سے اپنے اپنے کوٹوں پر سے بارش کا پانی پونچھ رہے تھے اور ادھر ادھر مکانوں کے پرنالوں پر سے بارش کا پانی ایک مسلسل شور کے ساتھ گر رہا تھا۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ گلی کے لیمپوں کی روشنی گرتی بارش کے دھندلے نقاب میں ماند پڑ گئی تھی اور گلی میں اس سرے سے دوسرے سرے تک دھواں سا اٹھنے لگا۔ راجدہ کا مکان یہاں سے تیسرا یا چوتھا تھا۔ اس کے بھائی نے کوٹ کا کالر اٹھا کر کہا۔

''میرا خیال ہے گھر چلتے ہیں۔ یہاں کتنی دیر تک کھڑے رہیں گے؟''

اس ابر آلود رات' بارش کی لگاتار گونج میں کافی مدت کے بعد راجدہ کو پہلی بار دیکھنے کا خیال مجھے بڑا تسکین دہ محسوس ہوا۔ چنانچہ تیزی سے بھاگ کر ہم راجدہ کے گھر میں داخل ہو گئے۔ دیوان خانے کی بتی روشن تھی اس نے مجھے نیچے بیٹھنے کو کہا اور خود کپڑے بدلنے اوپر چلا گیا۔ میں نے دیوان خانے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے کی فضا گرم اور بے حد مہربان تھی اور وہاں سگریٹ کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کرسیاں' آتش دان کے قریب کھسکی ہوئی تھی اور آتش دان میں لکڑیوں کے جل جانے پر دہکتے ہوئے کوئلوں کی سرخ لو جگمگا رہی تھی۔ تپائی پر ریڈیو خاموش پڑا تھا۔ قریب ہی راکھ دان میں تازہ بجھے ہوئے سگریٹ میں سے دھوئیں کی پتلی لکیر اٹھ رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ابھی کوئی وہاں سے اٹھ کر گیا ہے۔ کمرے کا حلیہ آج سے کچھ عرصہ پہلے کی نسبت بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ فرش پر دری کی بجائے کافی بڑا قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک طرف پلنگ کے قریب نئی طرز کا سنگھار میز پڑا تھا۔ جس پر ہر قسم کا سنگھار کا سامان چمک رہا تھا۔ سنگھار میز کے کونے میں سعید کی تصویر چاندی

کے فریم میں مسکرا رہی تھی۔ پلنگ کے پاس ہی سرہانے کی طرف ایک چھوٹے سے میز پر کچھ کتابیں' پیڈ اور قلم دوات اور ٹیبل لیمپ رکھا ہوا تھا۔ کارنس کی پٹی ہلکے سبز رنگ کی ریشمی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور دونوں کناروں پر گلدانوں میں کاغذی رنگین پھول اصلی پھولوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ کارنس کے اوپر ہی شیراز کے پرانے دروازوں' لمبے لمبے پراسرار جالی دار جھروکوں اور مسجد کے دودھیا میناروں والی تصویر لٹک رہی تھی۔ یہ تصویر اور ریڈیو پہلے اوپر ہوا کرتے تھے۔ مجھے یہ سوچنے میں بالکل دیر نہ لگی کہ یہ کمرہ راجدہ بیگم کا تھا۔ میں نے راکھ دان میں سگریٹ مسلا اور ریڈیو کی بتی روشن کر دی۔

لاہور۔۔۔۔۔۔۔ دلی۔۔۔۔۔۔۔ بمبئی۔۔۔۔۔۔۔ ریڈیو کی سوئی ڈائل کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر چکی تھی۔ معاً ایک جگہ میرا ہاتھ خود بخود رک گیا۔ یہ قاہرہ تھا اور وہاں سے عربی موسیقی کا پروگرام شروع تھا۔

دف بج رہا تھا اور لڑکے اور لڑکیاں مل کر گا رہے تھے۔ گیت کے بول میری سمجھ سے باہر تھے۔ مگر ان کی گہری لمبی۔۔۔۔۔۔ سوگوار کانپتی ہوئی تانیں دل پر برابر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہ تانیں لرز لرز کر دل کی گہرائیوں سے اٹھتیں اور شعلے کی مانند لپک کر پھیل جاتی تھیں۔ ان میں سادگی' سچائی اور تڑپ تھی۔

جب لڑکوں یا لڑکیوں کی ٹولی اپنے بول ختم کرتی تو دیر تک دف بجتے رہتے جیسے کوئی بدوی کھجور کے درخت کو ہلا رہا ہو اور پکی ہوئی موٹی موٹی کھجوریں زمین پر گر رہی ہوں۔ پھر لڑکیوں کی باریک آوازیں تنی ہوئی کمانوں سے نکلے ہوئے سنہری تیروں کی مانند اوپر کو اٹھتیں۔

یہ عرب کی صحرازادیوں کے گیت تھے جنہیں وہ خاص خاص موقعوں پر گاتی ہیں۔ کبھی چاندنی رات میں کھجوروں تلے ٹھنڈی ریت پر محفلیں جما کر' کبھی میدان جنگ سے لوٹتے ہوئے اپنے خاوندوں اور بھائیوں کی آمد پر اور کبھی قاہرہ ریڈیو اسٹیشن پر آ کر۔۔۔۔۔۔

دروازہ کھلا اور راجدہ کا بھائی اور سعید اندر داخل ہوئے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔

سعید بھورے اوورکوٹ میں ملبوس تھا اور راجدہ کا بھائی گرم چادر اوڑھے ہوئے تھا۔

"بڑے دنوں بعد نظر آئے۔۔۔۔۔۔۔ کہیں گئے ہوئے تھے؟" سعید نے میری طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا۔

"جی نہیں' یہیں تھا۔ دراصل کام کی زیادتی کی وجہ کے باعث۔"

"بہت خوب۔۔۔۔۔۔۔ آدمی کام کرتا ہی اچھا لگتا ہے۔" سعید نے بوڑھوں کی مانند مجھے نصیحت کی۔ راجدہ کا بھائی سنگھار میز

کی دراز دیکھ کر بولا۔

"سگریٹ ختم ہو گئے کیا؟"

اور میں نے جیب سے دو مارٹیر کا ڈبہ نکال کر میز پر رکھ دیا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا اور مجھے راجدہ کا خیال آ گیا۔ راجدہ کہاں ہے؟ شاید اوپر سو رہی ہو گی۔ اس نے تو کہا تھا میں زہر کھا لوں گی۔ کیا اسے میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی؟

دروازہ پھر کھلا اور عطی اور اختر اندر داخل ہوئیں۔ اختر اپنی بچی اٹھائے تھی اور عطی کے ہاتھ میں سلائیاں اور نصف بنے ہوئے موزے تھے۔

"کہیں باہر گئے ہوئے تھے کیا؟" عطی نے کرسی آتش دان کے قریب لاتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں ------- یہیں تھا۔"

"اچھا!"

یہ ذرا سی "اچھا" کہہ کر وہ بڑے اطمینان سے موزے بننے لگی۔ جس طرح کوئی بچہ قلم چھڑک کر لکھنے میں مشغول ہو جائے۔ یہ "اچھا" سیاہی کا ایک دھبہ تھا جو میرے کپڑوں پر چھڑکا گیا تھا۔ اختر اور سعید تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ راجدہ کا بھائی اختر کی بچی سے کھیل رہا تھا۔ گلی میں روشن دانوں کے چھجوں پر گرتی بارش کا شور اندر سنائی دے رہا تھا۔ آتش دان میں آگ تیز کر دی گئی۔ عطی خاموشی سے اپنے کام میں لگی ہوئی تھی اور میں کرسی میں دھنسا خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے اس کے سنہری اور سپید چہرے کے باریک خطوط کو آگ کی روشنی میں چمکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً کالے کمبل میں منہ سر لپیٹے کوئی دروازے میں نمودار ہوا۔ کمبل پر بارش کے قطرے جا بجا چمک رہے تھے۔ سب پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔ اس آدمی نے کمبل میں سے ایک ہاتھ نکال کر اسے منہ پر سے کھسکایا اور یہ چچا صاحب تھے۔ چچا اپنی کرنجی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"باہر بارش نے تو برا حال کر دیا ہے۔ اندر کیا خفیہ میٹنگ ہو رہی ہے؟"

میں ہنس پڑا اور کوئی نہ بولا۔ ویسے زیر لب سبھی مسکرا رہے تھے۔ چچا اتنا کہہ کر سنگار میز کی طرف بڑھا اور اس کی درازوں میں دیر تک کچھ تلاش کرتا رہا اور کسی نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ آخر وہ خود ہی عطی کی جانب مڑا۔

"بھئی لڑکی ------- میں موم بتیوں کا سالم بنڈل لایا تھا اور اسی دراز میں رکھا تھا۔ غائب کیوں ہو گیا؟"

"آپ ہی لائے تھے آپ ہی نے رکھا تھا اور آپ ہی جانیں۔"

عطی نے موزے بنتے ہوئے جواب دیا اور چچا زیرِ لب نہ معلوم کیا بڑبڑاتا ہوا پھر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔

سعید بولا۔

''چچا! موم بتیوں کی کیا ضرورت ہے؟'' چچا خاموش رہا۔ آخر ایک جگہ موم بتیوں کا سالم بنڈل مل گیا اور وہ کمبل سے منہ سر چھپا باہر نکلتے ہوئے بولا۔

''ضرورت کیا ہے بھئی' بازی لگائی ہوئی ہے اور تیل ختم ہو گیا ہے۔'' وہ باہر نکل گیا اور سب ہنسنے لگے۔

دروازہ کھلا اور ایک دبلی پتلی سی لڑکی جس کا قد انار کا بوٹا اور ہونٹ باریک اور رخسار ریشمی تھے دونوں ہاتھوں میں چائے کا ٹرے لیے سنبھل کر قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ یہ راجدہ تھی۔

راجدہ ------ میری موم بتی' میری انگرڈ برگمین اور میری جین ایر اور میرے میدان کی آگ اور میرے پہاڑ کا سورج ------

راجدہ نے جھک کر ٹرے میز پر رکھا اور پھلوں سے لدی ہوئی شاخ نے لچک کر زمین کو اپنے شیریں میوے پیش کر دیے اور ایران کی زہرہ جمال دوشیزاؤں نے اپنے سوڈانی دف اٹھائے اور قہوہ خانوں کی پر اسرار فضا میں رقص کرنا شروع کر دیا۔ پرانے قالینوں پر' مومی شمعوں کی دھیمی روشنی میں ان کے نیم عریاں ادھ پکے سنہری جسم بے قرار شعلوں میں تبدیل ہو گئے اور کم عمر خوبصورت بچے ترکی فنجانوں میں گرم گرم قہوہ لیے ادھر ادھر گھومنے لگے۔ شیراز کے باغات میں چاندی کے فوارے ابل رہے تھے اور مسجدوں کے دودھیا گنبدوں کے اوپر نیلے آسمان پر سپید و براق کبوتروں کی ٹولیاں محو پرواز تھیں اور لمباڈی کے خیابانوں میں پتھریلی شاہراہوں کے دونوں جانب جھکی ہوئی نرم بیلوں پر کاسنی رنگ کے انگوروں کے خوشے پک گئے تھے اور ان پر سفیدی سی جم رہی تھی۔

گلمرگ کی رنگین وادیوں میں چناروں کی رنگین ٹہنیوں پر سرخ سرخ شگوفوں کی شمعیں روشن ہو گئی تھیں۔ باغات باغات کے گھنے ذخیروں میں کشمیر کی شوخ و شنگ لڑکیاں سیب کے درختوں پر سے سیب اتار اتار کر اپنے ٹوکروں میں رکھ رہی تھیں اور راجدہ نے ٹرے میز پر رکھ دیا۔ راجدہ خاموشی سے باہر نکل گئی۔ اس نے کسی سے بات نہ کی۔ اس نے کسی کی طرف آنکھ نہ اٹھائی۔

راجدہ نے لکھا تھا' میں زہر کھا لوں گی اور راجدہ نے زہر کھا لیا تھا۔ چائے کا گرم گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے میں نے راجدہ کی آواز سنی۔ وہ اپنی امی کو بلا رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خواب کے جزیروں سے مجھے آوازیں دے رہی ہے۔

میرے دل میں ایک اجنبی اور مقدس خیال بجلی کی مانند چمکا اور میرا ذہن چکا چوند ہو کر رہ گیا۔

ایک قسم کی بزرگی، عظمت اور برتری کا خیال۔

جو بھرتری ہری کو جنگلوں میں موسیٰ کو آگ کی طرف کھینچتا ہوا لے گیا اور جس نے کالی داس کو اس کی میگھ دوت اور ڈانٹے کو ڈیوائن کامیڈی لکھنے پر اکسایا۔ میں نے سگریٹ آتش دان میں پھینکا اور اس خیال کی تعظیم میں میرا سر خودبخود جھک گیا۔ جب میں گلی سے نکل رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں صد بہار درآغوش، اقلیم محبت کے سنہری خیابانوں میں داخل ہو رہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ پر ایک ایسے بجرے کا گمان ہو رہا تھا جس کے ریشمی بادبان تنے ہوئے ہوں اور جسے مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے آہستہ اور۔۔۔۔۔۔ پرسکوں جھیلوں، روشن پہاڑوں اور پھولوں سے ڈھکے ہوئے گمنام جزیروں کی طرف لیے جا رہے ہوں۔

آج راجدہ کی شادی کو تیسرا سال ہو رہا ہے۔

مگر میری راجدہ اس وقت بھی میرے پاس ہے۔ وہ ازل سے میرے پاس ہے اور ابد تک میرے پاس رہے گی اور اس کا سعید کی راجدہ سے کوئی تعلق نہیں۔ جس طرح کسی قدآور درخت سے چمٹی ہوئی لچکیلی بیل رات کی خاموشی میں اپنی غذا حاصل کرتی ہے اسی طرح میں راجدہ کی محبت سے اپنی غذا حاصل کر رہا ہوں۔

میں اس کی محبت کو ہضم کر گیا ہوں اور اس کے اجزا میرے روح و بدن میں سرایت کر گئے ہیں۔

سعید کی راجدہ کے تین بچے ہیں اور اب وہ سعید کی راجدہ کم اور اپنے بچوں کی زیادہ ہے۔ لیکن میری راجدہ صرف میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی بے لوث محبت کی تمام جائیداد کا واحد مالک ہوں۔ وہ ایک سدابہار درخت ہے جو مجھے اپنی ٹھنڈی چھاؤں عطا کرتا ہے، ایک چشمہ ہے جس کا شفاف پانی محض میری خاطر زمین سے پھوٹتا ہے اور ایک گمنام وادی ہے جس کے نشیب و فراز صرف میرے قدموں کی چاپ سے آشنا ہیں۔

جب مشرق میں صبح ہوتی ہے تو میں اسے اپنے ساتھ کرنوں کا تاج پہنے زریں تخت پر بیٹھے اوپر کو اٹھتے دیکھتا ہوں۔ شام کے وقت جب وادیوں پر اندھیرا چھانے لگتا ہے تو ہم پہاڑ پر چڑھ کر دن کی رخصتی کا گیت ہم آواز ہو کر گاتے ہیں۔

اور جب رات کا جادو پھیل جاتا ہے تو وہ ستاروں کے دریچے کھول کر نورانی راستوں پر سے گزرتی ہوئی میرے پاس آ جاتی ہے اور ہم تمام رات گلاب کے پیالوں میں شبنم کی شراب پیتے ہیں اور ازلی و ابدی محبت کے غیر فانی گیت گاتے رہتے ہیں۔

ہر جگہ، ہر مقام پر ہمارے قدم ایک ساتھ اور ہم آہنگ ہو کر اٹھتے ہیں۔ اس کا خیال مجھے اپنے تئیں اس بادل کا احساس دلاتا ہے جو خشک اور بنجر زمینوں پر بارش کے موتے لٹانے کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے بلند ہوا ہو۔

وہ بوڑھی ہے نہ جوان، کنواری ہے نہ شادی شدہ۔۔۔۔۔۔۔ اسے وقت کا بوڑھا ہاتھ کبھی نہیں چھو سکتا۔ وہ اس کی دسترس سے باہر، لازوال، اٹل اور غیر فانی ہے۔

وہ ہر لحظہ، ہر گھڑی ہر پل میرے ساتھ ہے۔ وہ اس وقت بھی میرے دل پر اپنی محبت کے نازک پردوں کا سایہ کئے ہوئے ہے جبکہ میں اس کی داستان قلمبند کر رہا ہوں۔

سعید کی راجدہ سے میرا کوئی تعلق نہیں اور میں اس کے بارے میں کبھی کوئی افسانہ نہیں لکھوں گا۔

◆◆◆

ایک لڑکی...... کئی لڑکیاں

دریائے بیاس پر پھیلا ہوا کہرا روپہلی چاندنی میں بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا معلوم ہو رہا تھا جو زمین پر اتر آیا ہو اور سردی سے ٹھٹھر کر وہیں جم گیا ہو۔ کنارے کنارے نیلگوں دھند میں ڈوبے ہوئے کھیتوں اور غیر ہموار میدانوں کا سلسلہ کرتار پور گاؤں تک چلا گیا تھا۔ یہ گاؤں تیس چالیس گھرانوں پر مشتمل تھا جسے کیکر، شیشم، پیپل اور بیر کے درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ حوالدار تخت سنگھ کا دو کوٹھڑیوں اور ٹیڑھے بینگے دالان والا گھر بستی کے دریا والی نکڑ پر تھا۔ اس گھر میں آج اس کی چھوٹی بہن ہربنس کور کا بیاہ ہو رہا تھا۔

پت جھڑ کی سرد اور اجلی رات میدانوں، کھیتوں، بستیوں اور ویرانوں پر اپنا نقرئی آنچل پھیلائے سو رہی تھی۔ دن بھر کے تھکے ماندے کسان بند کوٹھڑیوں میں، لحاف اوڑھے میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ گاؤں کی تنگ اور سنسان گلیوں میں آوارہ کتے سردی میں ہونک رہے تھے اور بیاہ والے گھر سے ڈھولک کی دھیمی دھیمی تھاپ سنائی دے رہی تھی۔ یہ ڈھولک دلہن کی کوٹھڑی میں دھمک رہی تھی۔ ستونت سنگھ پٹواری کے گھر سے منگوایا ہوا لیمپ چھت سے لٹک رہا تھا اور اس کی اجلی روشنی میں بچیوں کے گوٹہ لگے کیسری کپڑے، عورتوں اور لڑکیوں کے بھدے زیور اور ہربنس کور کا سنہری جھومر جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ فضا میں مکھن کی کھٹی باس اور آملوں کے تیل کی تیز مہک بسی ہوئی تھی جس کی وجہ سے دلہن کے ہونٹوں اور ناک کے درمیانی حصے پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمکنے لگے تھے۔ اس کی سہیلیاں ہنس ہنس کر اس سے چہلیں کر رہی تھیں اور ڈھولک پر گیت جاری تھی۔

”دیئیں دیئیں وے بابلا اوس گھرے

جس سس دے بالڑے پت

اک منگاں، ایک ویاہواں، میں تاں شادیاں ویکھاں گی نت

بابل تیرا پت ہووے۔۔۔۔۔۔“

اور ساتھ والی کوٹھڑی میں رضیہ کھاٹ پر لیٹی، گردن تک لحاف اوڑھے چھت کو تک رہی تھی۔

طاق میں جلتے ہوئے دیے کی دھیمی روشنی میں اس کا گول گول سپید چہرہ کمزور اور کملایا ہوا سا تھا۔ جیسے کئی دنوں سے بیمار ہو۔ پاس ہی دوسری کھاٹ پر اس کا خاوند حوالدار تخت سنگھ لحاف میں منہ سر لپیٹے خراٹے بھر رہا تھا۔ اس کے خراٹوں کی آواز رضیہ کو بڑی دور سے

آتی معلوم ہو رہی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس آواز سے سہمی ہوئی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جنگلی بلا انسانی خون کی بو پا کر، فضا میں سونگھتا ہوا، دبے پاؤں اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ساتھ والی کوٹھڑی میں سے ڈھولک کی آواز اور گیت کے سیدھے سادھے بول اس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ یہ بول سمندر کی ہلکی پھلکی لہروں کی طرح اس کے اوپر سے ہو کر گزر رہے تھے۔ رضیہ اپنے آپ کو ان لہروں کے حوالے کر دینا چاہتی تھی۔ یہ گیت کبھی اس نے اپنے گھر میں، اپنی سہیلیوں اور رشتہ داروں کے گھروں میں شادی بیاہ کے موقعہ پر گائے تھے، سنے تھے اور یہی گیت گاتے ہوئے، سنتے ہوئے، روتے ہوئے، اس نے اپنی جان سے پیاری سہیلیوں کو ان کے سسرال رخصت کیا تھا۔ یہ گیت، گمنام سمندروں کی ہلکی پھلکی، نرم رو لہریں جو ویران چاندنی کی غمگین خاموشی میں پرانی یادوں کے گمنام جزیروں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ کھاٹ پر نہیں بلکہ کسی کشتی میں لیٹی ہے جو پراسرار دھندلکوں میں سے ہوتی ہوئی چپ چاپ لہروں پر اپنے آپ بہے جا رہی ہے۔ گیت کا ہر بول ان دیکھا چپو بن کر اس کی کشتی کو کھے رہا تھا اور اس کا ماضی وقت کی تاریک ڈھلوانوں میں سے بانہیں پھیلائے، اس کی طرف پرواز کر رہا تھا۔ رضیہ کے کانوں میں دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھی۔ جیسے گلیوں میں بچے کھیل رہے ہوں، گھروں میں عورتیں باتیں کر رہی ہوں، بازاروں میں لوگ آ جا رہے ہوں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ان آوازوں کے قریب سے قریب تر ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حوالدار تخت سنگھ کو، اس کی بہن ہربنس کور اور ان کی کچی کوٹھریوں اور ٹیڑھے میڑھے دالان والے مکان کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ رہی ہے اور امرتسر جا رہی ہے، اپنے گھر جا رہی ہے، جس کے صحن میں اس کی ماں گیندا، عشق پیچاں اور موتیئے کے گملوں کے پاس مصلے پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہوگی اور اس کا بڑا بھائی، ورکشاپ سے واپس آ کر باورچی خانے میں چولہے کے پاس ہی بیٹھا نمکین چائے پی رہا ہوگا۔

بھائی ------- اس کا شاعر بھائی، دبلے پتلے سفید بدن، لہریا بالوں اور چمکیلی آنکھوں والا ------- جو رضیہ کو دوسرے ملکوں کی عجیب عجیب باتیں سنایا کرتا تھا، جو منہ اندھیرے اٹھ کر محلے کے چوہدری کے بچوں کو انگریزی پڑھانے جاتا۔ جس کی ہر بات رضیہ کو ایسے جملے کا گمان ہوتا جس میں اس کی بے حد تعریف کی گئی ہو اور جو رضیہ سے بڑی محبت کرتا تھا۔

اس کے بدن میں سنسنی دوڑ جاتی۔ طاق میں جلتے ہوئے دیے کی لو یکبارگی کانپی اور پھر سنبھل گئی۔ تخت سنگھ کے خراٹوں کی آواز دور سے دور تر ہونے لگی اور اس نیم روشن، نیم گرم کوٹھڑی کی خواب آلود فضا میں اسے امرتسر یاد آ گیا۔

امرتسر ------- جہاں شریف پورہ تھا، کمپنی باغ تھا، اس کا اسکول تھا اس کا محلہ اور اس کا گھر تھا۔

شہر کے مشرقی دروازے کے اندر ایک لمبی گلی کے موڑ پر پرانے چھجے والا مکان جس کے دروازے کے باہر گلی میں سنگین چبوترہ بنا

تھا، جس کی کھڑکیوں کا سبز رنگ موسلا دھار بارشوں اور تیز دھوپ کی مسلسل مار سے بالکل اڑ گیا تھا اور جس کے آنگن میں، دیوار پر عشق پیچاں کی نازک بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس بیل میں کاسنی کے پھول عجیب بہار دیا کرتے تھے۔ رضیہ کو انہیں دیکھ کر ہمیشہ گراموفون کے دھتو کا خیال آ جاتا تھا۔ بیل ٹین کی زنگ خوردہ بالٹی میں اگائی ہوئی تھی۔ اس کی ماں انہی گملوں کے پاس مصلا بچھا کر صبح کی نماز پڑھا کرتی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ دیر تک تسبیح پر ورد کرتی رہتی اور جب آسمان پر دن کا اجالا پھیل جاتا، محلے میں مدھم شور بیدار ہو جاتا، ننھی چڑیاں چک چوں چوں کرتی رتن جو، گیندا، موتیا اور بیل کے پھولوں پر ٹھونگے مارنے لگتیں اور گلی میں بکریوں کا دودھ بیچنے والے کی تیز آواز کے ساتھ ہی بکریوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دینے لگتیں تو اس کی ماں دعا کے لیے اپنے ہاتھ پھیلا دیتی۔ دعا مانگ کر وہ نیند میں کھوئے ہوئے بچوں کے معصوم چہروں پر پھونکیں مار کر انہیں دھیمی آواز میں اٹھنے کو کہتی۔

”لالی، اجی، انور، سعیدہ اٹھو، دن چڑھ آیا ہے۔ رضیہ تم بھی اٹھو۔“

رضیہ دو تین بار کسلمندی سے پہلو بدل کر آنکھیں جھپکاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوتی، بال درست کرتی، الگنی پر سے دوپٹہ کھینچ کر اوڑھتی، بچوں کو بصد مشکل ہلا جلا کر اٹھاتی، بستر لپیٹ کر اندر رکھتی، چارپائیاں دالان میں ایک طرف دیوار سے لگاتی۔ آگ جلا کر پانی گرم کرتی، بچوں کے منہ ہاتھ دھلاتی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ادھیڑ عمر باپ، سر پر حاجیوں والا زرد رومال باندھے مسجد سے لوٹ آتا اور منہ ہی منہ میں درود شریف پڑھتے گملوں کے اوپر جھک کر ان پھولوں کی کانٹ چھانٹ میں لگ جاتا جنہیں چڑیاں ٹھونگے مار کر خراب کر گئی ہوتیں۔ دروازے پر بکریوں کا دودھ بیچنے والے کی آواز سنائی دیتی۔ انور بھاگ کر جگ میں دودھ ڈلوا لاتا۔

اس اثنا میں اس کا بھائی محلے کے چوہدری کے بچوں کو پڑھا کر واپس آ جاتا۔ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی رضیہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھتا۔ وہ اپنے بھائی کے لیے تولیہ، صابن اور پانی کا انتظام کرتی۔ اس کا منہ ہاتھ دھلاتی۔ برش سے اس کا پرانا کوٹ صاف کرتی اور تھوڑا بہت کھا پی کر جب وہ ورکشاپ جانے لگتا تو رضیہ سائیکل ڈیوڑھی سے باہر نکالنے میں بھی اس کی مدد کرتی۔ کسی وقت اس کا بھائی سائیکل ڈیوڑھی سے باہر نکال کر اس کی طرف پیار سے دیکھ کر مسکرا دیتا تو بہن کا دل خوشی سے نہال ہو جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ ورکشاپ تک چلی جائے۔

گھر کے دوسرے چھوٹے کام دھندوں سے فارغ ہو کر وہ خود منہ ہاتھ دھوتی اور چائے وغیرہ پی کر اپنی کتابیں اور کاپیاں ٹھیک کرنے لگ جاتی۔ اس دوران میں اس کی سہیلی اور ہم جماعت ثریا پہنچ جاتی اور وہ کتابیں اٹھا کر برقع اوڑھ کر سکول کی جانب ہو لیتی۔ اسکول شہر سے باہر کمپنی باغ میں تھا۔

اپنے محلے اور بازاروں کے شوروغل اور بھیڑ بھاڑ سے نکل کر جب وہ کمپنی باغ میں داخل ہوتی تو اسے یوں محسوس ہوتا گویا وہ کسی بہت بڑے ورکشاپ سے نکل ایک پرانی مسجد میں آ گئی ہے۔ وہ بڑی گرم جوشی اور آزادی کے ساتھ ثریا سے باتیں کرنے لگتی۔ میڈیکل کالج کے سفید پوش لڑکے اور لڑکیاں' سائیکلوں پر سوار ان کے قریب سے ہو کر گذر جاتیں اور اپنے پیچھے تنکچر آئیوڈین اور آئیڈو فارم کی ہلکی ہلکی بو چھوڑ جاتیں۔ رضیہ کو ان کے سرد اور بے جا چہرے دیکھ کر ہمیشہ اخبار کے اس حصے کا خیال آ جاتا تھا جہاں ''اسٹاپ پریس'' لکھا ہوتا ہے۔

واپسی پر جب کبھی وہ تنہا ہوتی تو وہ کمپنی باغ میں سے گذرتے ہوئے اسے ہر قدم پر گمان ہوتا کہ وہ محض راستہ طے نہیں کر رہی بلکہ سیر کر رہی ہے۔ جیسے یہ رشتہ شہر کی گنجان آباد گلیوں اور پر شور بازاروں کی بجائے پہاڑیوں سے گھرے ہوئے شاداب مرغزاروں اور خاموش پھولوں بھرے جنگلوں کی جانب نکل جاتا ہے۔ اسے سارے باغ میں وہ چھوٹی سی روش بڑی پسند تھی جس پر شروع سے لے کر اخیر تک آم کے گھنے درختوں کا سایہ تھا اور جہاں چند ایک درختوں کے تنوں میں بیٹھنے کے لیے آمنے سامنے کرسیاں تراشی ہوئی تھیں۔ ایک جگہ رنجیت سنگھ کے وقتوں کی چھوٹی سی بارہ دری تھی۔ جس کے زنگ خوردہ گنبد پر آم کی آڑھی ترچھی ٹہنیاں لیٹی رہتی تھیں۔ بیساکھ کے وسط میں جب آموں کے درختوں میں بور آنے کا وقت آتا تو ٹہنیوں پر سے شیرا سا ٹپکنے لگتا۔ سارا راستہ میٹھی مدھم خوشبو سے مہک اٹھتا۔ دن بھر بھنوروں اور شہد کی مکھیوں کی ٹولیاں درختوں کے چکر کاٹتی رہتیں۔ جہاں یہ سایہ دار روش ختم ہوتی تھی وہاں دونوں طرف فوارے لگے تھے۔ ان فواروں پر جھولتی ہوئی یوکلپٹس کی لمبی شاخیں ہر وقت پانی سے دھلی رہتی تھیں۔ یہاں سے گذرنے میں رضیہ کو بڑا لطف آتا تھا۔ ہری بھری گھاس پر گرے ہوئے پتے' کیاریوں میں رنگ برنگے پھول' درختوں میں چھپانے والے پرندوں کی میٹھی بولیاں' لمبے لمبے درختوں کی جھولتی ہوئی شاخیں اور اوپر کھلا' روشن' صاف اور گہرا نیلا آسمان ------ رضیہ کو اپنے شاعر بھائی کی نظموں کا خیال آ جاتا۔ وہ سوچتی اس کا بھائی یقیناً یہیں بیٹھ کر نظمیں لکھتا ہوگا۔ کھیلوں والے پلاٹ میں وہ اسکول کے بچوں کو ادھر ادھر کھیلتے' ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے اور زور زور سے ہنستے دیکھتی تو اس کا جی بچہ بن کر آزاد اور مسرور بچوں کی منڈلی میں شامل ہو کر چمکیلی دھوپ میں سبزے پر کھیلنے کو چاہتا۔

کمپنی باغ سے نکل کر موٹروں' تانگوں' سائیکلوں اور پیدل لوگوں سے بھرے ہوئے ہال بازار میں اسے ہر قدم پر چوکنا رہنا پڑتا۔ علاوہ ازیں ہر شخص اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے گزرتا۔ اسے یہ نگاہیں اپنے جسم میں سوئیوں کی مانند چبھتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ ہال بازار میں پہنچ کر ہر شخص اپنی چال بھول جاتا تھا۔ یہاں ہر شخص ہتھوڑوں کی طرح پاؤں مار کر دوڑتا ہوا چلتا تھا۔ جیسے آدمی

نہ ہو مشین، جسے پیچھے سے دھکیلا اور آگے سے کھینچا جا رہا ہو۔ مگر کمپنی باغ میں ہر آدمی کے قدم اطمینان سے اٹھتے تھے۔ جیسے وہ باغ کا مالی ہو جو پھولوں کا گلدستہ ہاتھ میں لیے بڑے سکون کے ساتھ ایک کیاری سے دوسرے پلاٹ کی کیاری کی طرف بڑھ رہا ہو۔

یہاں وہ اسکول اور کالج کے ان لڑکوں کو بڑی فراخدلی سے معاف کر دیتی جو کبھی کبھی گذرتے ہوئے اس پر ایک آدھ فقرہ کس دیتے تھے۔ جیسے وہ اس کے اپنے ہی لوگ ہوں، اس کے اپنے ہی گھر کے آدمی ہوں، اس کے اپنے ہی بھائی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ہال بازار میں وہ ہر گھورنے والے کا منہ نوچ لینا چاہتی تھی۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باوجود اکثر شریف پورہ کی طرف سے ہو کر گھر جاتی تھی۔

شریف پورہ کی آبادی ریل کا پھاٹک عبور کرتے ہی شروع ہو جاتی تھی۔ شریف پورہ نئی آبادی تھی، اس لیے اس کی گلیوں میں نئے بنے ہوئے مکانوں میں ایسی ٹھنڈک رہتی تھی۔ یہاں سے گزر کر وہ مسلم ہائی سکول کے سامنے گندگی سے بھرے ہوئے میدان کے ساتھ جانے والی ڈیڑھ فرلانگ لمبی سڑک کو عبور کر کے گندے نالے کے پل تک پہنچتی۔ یہ نالہ باغ کے ساتھ ہو کر بہتا تھا۔ باغ میں پھولوں کی کیاریاں اور فوارہ تھا۔ جس کے حوض میں قریبی آبادی کے لڑکے دن بھر تیرتے رہتے تھے۔ یہاں پھولوں کی خوشبو گندے نالے کی بدبو تلے دبی رہتی تھی۔ پل کے سامنے میونسپل کمیٹی کی لائبریری تھی جس کے سفید گنبد اور مدور دیواروں پر گوالنوں نے جگہ جگہ اپلے تھوپ رکھے تھے اور جس کے برآمدے میں سنگین بنچوں پر بیٹھے ہوئے نئی خانقاہ کے مجاور دن بھر تاش کھیلنے، بھنگ گھوٹنے، چرس پینے اور گالیاں بکنے میں مشغول رہتے تھے۔ پھر شہر کا مشرقی دروازہ اور اس کے بعد اس کا محلہ آ جاتا۔ برسات کے دنوں میں بازار اور گلیاں کیچڑ سے بھر جاتیں اور موسلا دھار بارش میں گھٹنے گھٹنے پانی چڑھ آتا۔ مگر کمپنی باغ کا سبزہ دھل کر نکھر جاتا، درختوں میں کوئل کی کوک گونجنے لگتی اور فضا میں گیلی مٹی کی بو پھولوں کی خوشبوؤں میں تحلیل ہونے لگتی۔

سرما کی آمد کے ساتھ ہی دھوپ کی حدت ماند پڑ جاتی اور راتیں زیادہ چمکیلی اور زیادہ دلکش ہو جاتیں۔ ستاروں کے فانوسوں میں جیسے یہ تیل بتی ڈالنے کا موسم ہوتا تھا۔ ان کی جوت زیادہ شوخ اور بھڑکیلی ہو جاتی۔ گلیوں میں جہاں دن بھر اونچے مکانوں کی چھاؤں رہتی بہت جلد ٹھنڈ اتر آتی اور سر شام کھلنڈرے لڑکوں کا شور مدھم پڑ جاتا اور وہ اپنے اپنے بستروں میں ہانک دیے جاتے۔ رضیہ کو یہ دھلے دھلائے ستاروں اور چپ چاپ گلیوں والی خوبصورت راتیں بڑی بھلی لگتی تھیں اور اس کا بھائی تو اس رات کا متوالا تھا۔ ان دنوں ہر شے میں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی۔ سگریٹ پیتا تو اس انداز سے گویا کوئی نظم لکھ رہا ہو۔ حالانکہ نظم لکھنے سے پہلے وہ ہمیشہ سگریٹ بجھا دیا کرتا تھا۔ شام کا کھانا کھا کر وہ شہر سے باہر کھلے کھیتوں اور سایہ دار باغوں میں گھومنے کے لیے نکل جاتا اور جب واپس آتا تو اس کا

چہرہ یوں مسرور اور تمتمایا ہوتا جیسے وہ کئی ماہ کسی پہاڑی مقام پر گزار کر آ رہا ہو۔ لیکن ہفتے میں ایک آدھ دن ضرور آتا جب وہ جلدی ہی گھر لوٹ آتا اور دیوان خانے میں رضیہ اور دوسرے بہن بھائیوں کے درمیان بیٹھ کر انہیں کہانیاں' لطیفے اور دوسرے ملکوں کی عجیب عجیب دلچسپ باتیں سناتا رہتا۔ اس دن رضیہ پہلے ہی سے دیوان خانے میں ہر شے قرینے سے لگا دیتی۔ کتابوں پر سے گرد جھاڑتی' راکھ دان صاف کرتی' دیواروں پر لٹکتی ہوئی تصویروں کے شیشے پونچھتی' پلنگ پر چادر کی سلوٹیں درست کرتی' سماوار کی راکھ جھاڑ پونچھ کر اسے چمکا دیتی۔ اس میں کوئلے ڈال کر انہیں آگ دکھا دیتی اور اندازے کا پانی ڈال کر اسے دالان میں رکھ دیتی۔

لالی' انور' اجی اور بلو۔۔۔۔۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے دیوان خانے میں تمام بچے جمع ہو جاتے۔ ماں پلنگ پر بیٹھ کر تسبیح پھیرنے اور آیتیں پڑھنے لگتی اور پھر اس کا دبلا پتلا' لہریا بالوں والا اور چمکیلی آنکھوں والا بھائی' ہونٹوں پر مخصوص تبسم لیے کمرے میں داخل ہوتا اور بچوں کا شور ہلکی ہلکی سرگوشیوں اور کھسر پھسر میں تبدیل ہو جاتا۔ سعیدہ چولہے کی ساری آگ کانگڑی میں ڈال کر اسے گود میں لیے بچوں کی ٹولی میں آگے ہو کر بیٹھ جاتی۔

"باجی' ذرا پرے ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔۔ میرے آگے کیوں آن بیٹھی ہو؟"

بلو اپنا کپا سامنہ پھلا کر اسے روہانسی آواز میں کہتا۔ وہ کہانیاں سننے کے علاوہ اپنے بھائی کا چہرہ بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ سعیدہ ذرا پرے کھسک جاتی اور ادھر سے جھٹ لالی بول اٹھتی۔

"باجی! مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔"

اور سعیدہ کانگڑی سنبھال کر چمک اٹھتی۔

"توبہ۔۔۔۔۔۔۔ کہیں بیٹھنے بھی دو گے' وہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے کیا؟"

سماوار دیوان خانے میں لا کر اس میں سبز چائے کی پتیاں ڈال دی جاتیں اور ذرا سی دیر میں بند کمرے کی گرم فضا میں چائے کی لطیف خوشبو پھیل جاتی۔ رضیہ کا بھائی سگریٹ کا کش لے کر راکھ جھاڑتا اور نرم لہجے میں اپنی باتوں کا آغاز کرتا۔

"پیرس' لندن اور ماسکو بہت خوبصورت شہر ہیں۔"

اور دور مشرق کے ایک گنجان آباد' معمولی شہر امرتسر کی تنگ و تاریک گلیوں میں بسنے والے بچوں کے معصوم چہروں پر خاموشی طاری ہو جاتی اور وہ نیم وا ہونٹوں اور کھلی کھلی آنکھوں سے اپنے بھائی کو تکنے لگتے جیسے وہ پیرس' لندن اور ماسکو کی عالیشان عمارتیں اور لمبی چوڑی سڑکیں دیکھ کر دم بخود رہ گئے ہوں۔

”ان شہروں میں ہزاروں لائبریریاں ہیں جہاں جا کر لوگ خاموشی سے مطالعہ کرتے ہیں۔“

رضیہ کو اپنے شہر کی ”نئی خانقاہ“ کے ساتھ والی لائبریری یاد آ جاتی جس کے دودھیا گنبد اور مدور دیواروں پر گوالنیں اپلے تھوپا کرتی تھیں اور وہ چاہتی کہ وہ اپنے بھائی سے پوچھے' کیا ان شہروں میں گوالنیں نہیں ہوتیں؟ مگر وہ خاموش رہتی۔

”وہاں ہمارے شہروں کی طرح بچے نالیوں میں کیچڑ نہیں اچھالتے بلکہ ہر محلہ میں بچوں کے اپنے کلب ہوتے ہیں جہاں وہ شام کو اکٹھے ہوتے ہیں اور طرح طرح کے کھیلوں سے دل بہلاتے ہیں۔“

بچوں کے چہرے مایوس ہو کر دردناک انداز سے لٹک جاتے اور رضیہ کو ان پر ترس آنے لگتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے ان کا بھائی ان بچوں سے بڑی زیادتی کر رہا ہے۔ جیسے وہ انہیں بھرے میلے کی سیر کرانے کے بعد ویران کھنڈروں اور اجاڑ جنگلوں میں تنہا چھوڑنے کا ارادہ کئے ہے۔ وہ چاہتی کہ اس کا بھائی کوئی اور موضوع چھوڑ دے اور جب وہ سماوار کو قریب کھینچ کر چائے بنانے لگتی تو خود بخود ایک دوسرا موضوع چھڑ جاتا۔ بھاپ چھوڑتی گرم گرم سنہری چائے پیالیوں میں گرتی دیکھ کر بچوں کی توجہ بٹ جاتی۔ وہ غیر شعوری طور پر سماوار کی طرف کھسکنے لگتے۔ پھر چائے کا دور شروع ہو جاتا۔ اس دوران میں رضیہ کی ماں خاموشی سے عبادت میں مشغول رہتی' اس کے لیے پیرس' لندن اور ماسکو کا خوبصورت ہونا اور وہاں ہر محلے میں بچوں کے کلبوں کا ہونا ایک ایسی بات تھی جس سے اسے اور اس کی لاکھوں بہنوں کا کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ پیرس' لندن' ماسکو' یروشلم' چین اور انڈونیشیا سے دور۔۔۔۔۔۔۔ بہت دور ایک ایسے مینار میں تسبیح و مصلا لیے بیٹھی تھی جس کے نیچے سے زمین وقت کے ساتھ ساتھ کھسکتی جا رہی تھی۔ وہ دنیا کے لحظہ بہ لحظہ بدلتے ہوئے حالات سے بے خبر آنکھوں پر پٹی باندھے ایک ایسی سڑک پر دوڑے جا رہی تھی جس کے اختتام پر ”خطرہ۔۔۔۔۔۔ راستہ بند ہے“ کا بورڈ لگا تھا۔

چائے کے بعد بچے یکے بعد دیگرے جمائیاں لیتے ہوئے اوپر والی منزل میں کھسک جاتے۔ ماں تسبیح گلے میں ڈالے سو جاتی اور وہ دونوں بہن بھائی رات گئے تک باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کبھی رضیہ کے بھائی کی چمکیلی آنکھیں کہیں خلاؤں میں کھو جاتیں اور اپنے بھائی بندوں کی روزمرہ زندگی کے غموں اور دکھوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی آواز میں ایک انوکھا درد اور تلخی پیدا ہو جاتی' وہ رضیہ کی طرف افسردہ نظروں سے دیکھ کر کہتا۔

”رضیہ! ہم لوگ زندگی بسر کرنے کے ڈھنگ سے ابھی تک ناواقف ہیں اور جانے ابھی کتنی مدت اور اسی جہالت اور اندھیرے میں گزرے گی۔ ہمیں ہر قدم پر نت نئے غموں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جا رہا ہے۔ مسجدوں

اور کارخانوں کی طرف اور کارخانوں سے مسجدوں کی طرف بس یہی ہماری زندگیوں کا محور اور نہتا ہے۔ ہم یوں زندگیاں گزار رہے ہیں جیسے کوئی سنگین گناہ کا کفارہ ادا کر رہے ہیں۔ کاش! ہم میں سے کسی ایک کو بھی اس سنگین گناہ کی ٹوہ مل جائے جس کی پاداش میں ہمیں کرۂ ارض پر یوں درماندہ اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہے۔ اٹلی کے ایک شاعر دانتے نے آسمانی جہنم کا نقشہ کھینچا تھا۔ وہ بیوقوف تھا۔ اس نے اس جہنم کو نظر انداز کر دیا جو اس وقت اٹلی کے ہر شہر' ہر گلی کوچے میں دہک رہا تھا۔ میں ایک کتاب میں اپنی دنیا کے جہنم کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہوں۔ یہ جہنم بے گناہ لوگوں کا جہنم ہے۔ جس کے ایندھن میں سے ایک میں بھی ہوں' تم ہو' اماں ہے' ہمارا سارا گھر ہے' سامنے والا گھر ہے' اس کے پچھواڑے کے گھر' محلے' شہر' ملک ۔۔۔۔۔۔۔ سبھی ہیں۔

کاش! میں یہ کتاب لکھ سکوں۔

رضیہ سونے سے پہلے' بستر میں لیٹی' دیر تک خیالوں کا تانا بانا بنتی رہتی۔ وہ اپنی بہنوں اور اپنے بھائیوں کی بسر ہونے والی زندگی اور بسر ہو رہی زندگی کے ڈھنگ پر پہروں غور کرتی۔ اسے ان ملکوں کا خیال آتا جن کی آزادی اور خوشحالی کے بارے میں وہ اپنے بھائی سے بہت کچھ سن چکی تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنے گھر بار والوں کے ساتھ ایک تاریک اور گہرے کنویں میں پڑی ہے جس کا منہ ایک بہت بڑے پتھر سے ڈھکا ہوا ہے۔ اسے ان قصوں کا خیال آ جاتا جن میں خوفناک شکلوں والے دیو شہزادیوں کو کنوؤں میں پھینک کر ان کا منہ پتھروں سے بند کر دیا کرتے تھے اور ان پتھروں کو کوئی انسان لڑھکا نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچتی وہ کون سا دیو ہے جس نے اسے' اس کے بھائی کو' اس کی ماں کو' اس کے گھر کو' سامنے والے گھر کو' محلے کو' سارے شہر کو اور پھر کئی ملکوں کو' اس اندھیرے اور تاریک کنوئیں میں پھینک کر اوپر سے بند کر رکھا ہے۔ کیا کبھی اس کنوئیں کے منہ سے پتھر نہیں ہٹے گا؟ وہ کبھی اس تاریکی اور سردی سے نکل کر کھلی اور گرم دھوپ میں سانس نہ لے سکے گی؟ کہانیوں میں تو ایک نہ ایک دن وہ شہزادہ ضرور آ جاتا تھا جو دیو کو مار کر کنوئیں کا پتھر ایک ہاتھ سے پرے لڑھکا دیتا تھا لیکن اب وہ شہزادہ کب آئے گا؟ سوچتے سوچتے اس کا ذہن تھک جاتا' آنکھیں بند ہونے لگتیں اور وہ سو جاتی۔

اور پھر جب مسلم لیگ نے برطانوی حکومت کے سامنے اپنی ایک علیحدہ مسلم اسٹیٹ کا مطالبہ پیش کر دیا اور پنجاب میں لیگی وزارت کے پورے جوش سے مظاہرے شروع ہو گئے تو رضیہ کو محسوس ہوا کہ وہ شہزادہ آ گیا ہے اور کنوئیں سے پتھر ہٹنے والا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی کے ساتھ وہ بھی لیگی تحریک کی ایک سرگرم رکن بن گئی۔ عورتوں کے جلوس میں' سب سے اگلی قطاروں میں اپنی پوری قوت سے ''خضر وزارت مردہ باد'' ۔۔۔۔۔۔۔ ''دینا پڑے گا پاکستان'' کے نعرے لگاتے ہوئے کئی بار رلانے والی گیس کی زد میں آ

کر سڑک کے کنارے اوندھے منہ گری۔ ایک بار کوتوالی کے سامنے پولیس نے ان کے جلوس پر معمولی سا لاٹھی چارج کیا لیکن اسے غیر معمولی چوٹ آ گئی اور وہ ہفتہ بھر بستر پر پڑی رہی۔ مگر تندرست ہونے کے فوراً بعد وہ پھر میدان عمل میں اتر آئی۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ خواب جنہیں وہ اپنے بھائی کی باتیں سن کر دیکھا کرتی تھی اب پورے ہونے والے ہیں۔ اسے رہائی دلانے والا شہزادہ خوفناک دیو سے جنگ کر رہا ہے اور وہ عنقریب اپنے گھر والوں سمیت اس اندھیرے کنوئیں سے باہر نکلنے والی ہے جہاں تاریکی اور سردی میں رینگتے ہوئے اس کی آنکھیں اندھی ہو رہی تھیں اور تمام اعضاء مفلوج ہو رہے تھے۔

جب وہ شام کے وقت گلی میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو سبز جھنڈیاں اٹھائے ''خون کی ندیاں بہائیں گے'' ''پاکستان بنائیں گے'' اور ''قائداعظم کا فرمان' دینا پڑے گا پاکستان'' کے نعرے لگاتے سنتی تو دل خوشی سے اچھل کر حلق تک آ جاتا۔ وہ گلی میں سے گزرتے انہیں دیکھتی۔ وفور مسرت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے اور اس کا دل ہر بچے کو گود میں لے کر پیار کرنے کو چاہتا۔ بچے اپنے تمام کھیل بھول گئے تھے۔ اس کے شاعر بھائی کی آوارہ گردی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ دفتر سے آ کر رات گئے تک محلے کی لیگ کمیٹی کے دفتر میں کام کرتا رہتا تھا۔ دیوان خانے میں قائداعظم کی تصویریں اور ''پاکستان زندہ باد'' کے قطعے فریم میں جڑوا کر دیواروں پر آویزاں کر دیئے گئے تھے۔ سعیدہ اور انور اور لالی دن بھر سبز جھنڈیاں اور باریک کاغذ کے چھوٹے چھوٹے جھنڈے بنا کر انہیں جگہ جگہ نصب کرتے رہتے۔

''پاکستان'' اس لفظ کے آتے ہی رضیہ کے چہرے پر مسرت کے پھول کھل اٹھتے۔ اسکول میں اس نے بہت جلد اپنی ہم جماعت ہندو اور سکھ لڑکیوں کا اپنا دشمن بنا لیا۔ مگر اسے بالکل رنج نہ ہوا۔ اسکول جاتے ہوئے وہ کمپنی باغ میں سے گذرتی تو اسے ہر درخت پر پاکستان زندہ باد کا بورڈ لگا نظر آتا۔ گورنمنٹ گرلز ہائی سکول' پاکستان گرلز ہائی سکول میں بدلتا محسوس ہوتا اور وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی۔

وہ دیکھتی کہ پاکستان بن گیا ہے اور اس کے ہر شہر میں پیرس' لندن اور ماسکو کی طرح ہزاروں کی تعداد میں لائبریریاں کھل گئی ہیں۔ ہر محلے میں بچوں کے اپنے کلب بنا دیئے گئے ہیں۔ نئی خانقاہ کے ساتھ والی لائبریری کی مدور دیوار پر اپلے تھوپنے والی گوالنیں اب شہر سے باہر میدانوں میں اپلے تھوپتی ہیں۔ برآمدے میں بیٹھ کر بھنگ گھوٹنے' چرس پینے اور تاش کھیلنے والے تمام مجاور حکومت کی طرف سے کارخانوں میں کام پر لگا دیئے گئے ہیں۔ لوگ جہالت' لاعلمی اور مفلسی کے دلدل سے باہر نکل آئے ہیں۔ انہیں زندگی گزارنے کا ڈھنگ آ گیا ہے اور اب کسی ایسی کتاب کی ضرورت نہیں رہی جس میں اس دھرتی کے جہنم کا نقشہ کھینچا گیا ہو کیونکہ اب تمام جہنموں کے

دہانے سرد پڑ گئے ہیں جن میں بے گناہ لوگوں کو جھونکا جا رہا تھا۔ اب زمین پر کہیں بھی جہنم نہیں ہے۔ ہر طرف بہشت ہی بہشت ہے۔ بہار ہی بہار ہے۔

وہ خود تعلیم ختم کر کے نرس بن گئی ہے اور سفید براق لباس میں ملبوس' سر پر کلف لگے رومال کا دودھیا تاج رکھے بیمار انسانوں کی خدمت کر رہی ہے اور شہر میں کوئی بھکاری اور بھوکا نہیں رہا۔ ہال بازار میں سے گزرتے ہوئے اب کوئی شخص اس کی طرف گھور کر نہیں دیکھتا' کمپنی باغ میں اب کوئی لڑکا اطمینان اور خوشحالی سے اپنی دھن میں مگن ہے۔ ہر شے ملک کی ترقی اور تہذیب کے لیے اہم ترین پرزے کی طرح پورے خلوص اور دیانتداری سے سرگرم عمل ہے۔ کوئی کسی کا ان داتا نہیں' کوئی کسی کا محتاج نہیں۔

اسکول سے لوٹتے ہوئے انہی سنہرے خوابوں میں کھوئی ہوئی رضیہ جب اپنی گلی میں داخل ہوئی تو محلے کی عورتوں کو جلوس کی تیاری کرتے دیکھ کر اس کے قدم تیزی سے اٹھنے لگتے۔ کتابیں دیوان خانے میں پھینک کر وہ کچھ کھائے پیئے بغیر بجلی ایسی تیزی سے لپک کر جلوس میں آن شامل ہوتی اور تھوڑی ہی دیر بعد کالے برقعوں والی عورتوں کا سیاہ دریا گلی سے نکل کر شہر کے بازاروں کا رخ کر لیتا۔

لیکن شہر کے بازاروں میں اب ہر چیز اپنا رنگ بدل رہی تھی' جس طرح ریل گاڑی کے گزرنے سے پہلے سگنل گر جاتا ہے' پھاٹک بند ہو جاتا ہے اور ریل کی پٹڑی دور تک سنسان اور خالی خالی سی نظر آنے لگتی ہے یا جیسے طوفان آنے سے پہلے ہوا ایک دم بند ہو جاتی ہے' سمندر کی لہریں پرسکون ہو جاتی ہیں اور درختوں کی خاموش ٹہنیاں ہمہ تن گوش ہو کر ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح شہر کی ہر چیز' ہر شے' گوش بر آواز تھی۔ سگنل گر چکا تھا' پھاٹک بند ہو گیا تھا' پٹڑی دور دور تک سنسان تھی' ہوا بند ہو گئی تھی' درخت خاموش تھے' چپ چاپ تھے' کوئی شے آ رہی تھی' گاڑی آ رہی تھی' طوفان آ رہا تھا' ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا۔ عورتوں کے جلوس آہستہ آہستہ بند ہو گئے تھے۔ مسلم منڈیوں میں غیر مسلم تاجروں کی آمدورفت کم ہو گئی۔ مسلمانوں نے ہندو سکھ محلوں میں آزادی سے چلنا پھرنا بند کر دی۔ لوگ دبی زبانوں سے ہندو مسلم فساد کا تذکرہ کرنے لگے۔ انجمن پارک میں لوہے کا مال بیچنے والے کباڑیوں کی دوکانوں میں سے ریتیاں' سریے اور ٹین کے خالی ڈبے غائب ہو گئے۔ لوگ بازاروں میں چوکنے ہو کر چلنے لگے۔ مشترکہ آبادیوں میں جگہ جگہ پاکستان زندہ باد اور پاکستان مردہ باد لکھا نظر آنے لگا۔ ریستوران اور گھٹیا قسم کے قہوہ خانوں میں معمولی دوکاندار' بھکاری' تانگے والے' مزدور اور مستری چائے کی پیالیاں سامنے رکھے ہاتھ ہلا ہلا کر پاکستان کے لیے جان تک قربان کر دینے کی قسمیں کھانے لگے۔ دربار صاحب میں قریبی دیہات سے آئے ہوئے سکھوں کے جتھے جمع ہونے لگے۔ گورو رام داس کی سرائے میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ لیڈروں نے گلی گلی محلے محلے پھر کر تقریریں شروع کر دیں۔

”پاکستان بن کر رہے گا“

”ہندوستان ہمارا ہے“

اور

”راج کرے گا خالصہ“

عوام زور زور سے تالیاں پیٹتے، گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے اور اپنے لیڈروں پر اعتماد کا اظہار کرتے۔

منڈیوں میں تاجروں نے چیزیں سٹاک کر لیں۔ چاول، پیاز، گڑ اور نمک ایک دم غائب ہو گئے۔ اجناس کا بھاؤ تیز ہو گیا۔ ہر شے تگنی قیمت پر فروخت ہونے لگی۔ سینما والوں نے آخری شو بند کر دیا۔ رات کے وقت شہر میں مسلح پولیس کی ٹولیاں گشت کرنے لگیں۔ لوہے کی ٹوپیاں عام بکنے لگیں اور آخر شروع بہار کی ایک شام کو، جبکہ کمپنی باغ میں درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹنے اور آلوچہ اور ناشپاتی کی شاخوں پر پھول لگنے کا موسم تھا، ہال بازار میں فساد کا پہلا شعلہ بھڑک اٹھا اور ریل گاڑی شور مچاتی، دھول اڑاتی گئی، پٹڑیاں کانپ اٹھیں، بپھرتی جھاگ اڑاتی موجیں، ساحلی چٹانوں سے سر پٹخنے لگیں، تناور درخت تیز ہوائیں اکھڑ اکھڑ کر زمین پر گرنے لگے۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلے چھوڑ کر، بچوں کو سینے سے لگائے میدانوں کی طرف اڑ گئے اور ہال بازار میں بھڑکا ہوا شعلہ وہاں سے نکل کر ہر بازار، ہر گلی، ہر گھر اور ہر شہر میں پہنچ گیا۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام ہو گئیں۔ اخبارات انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے لگے۔ پے در پے کرفیو لگنے لگے اور ان برستے ہوئے چابکوں نے شہر کو ادھ موا کر دیا۔ گلیوں میں بند مکانوں، دوکانوں اور بیٹھکوں میں بیٹھے لوگوں کے مزاج چڑچڑے ہو گئے۔ ہر گھر میں بات بات پر جھگڑا ہونے لگا۔ دوکانوں پر، پان، تمباکو، چاول، سبزیاں، سگریٹ، دیا سلائیاں اور دیگر عام ضروریات کی چیزیں ختم ہونے لگیں۔ مہینے میں دو بار گورنمنٹ کے ٹرک راشن ڈپوؤں پر راشن پھینک جاتے اور لوگ خالی ڈبے، رومال اور پیسے لے کر وہاں صبح ہی سے جا کھڑے ہوتے۔ گلیوں کے منہ آہنی دروازوں سے بند کر دیئے گئے مگر لیڈروں کے منہ کوئی نہ بند کر سکا۔ وہ آزادی سے ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلتے رہے۔ پھولوں کو پانی دینے والے مالی اور پھلدار درختوں کی رکھوالی کرنے والے راکھے باغوں کو چھوڑ کر آبادیوں میں آ گئے۔ پھول سوکھنے لگے اور پھل طوطوں اور کوؤں کی نذر ہو گئے۔ امن کمیٹیاں جنگی اداروں میں تبدیل ہو گئے۔ مسجدوں مندروں اور گردواروں کے اندر چھریاں، کلہاڑے اور بلمیں اور دیسی ساخت کے بم دھڑا دھڑ تیار ہونے لگے۔

یہ کیا ہو رہا تھا؟

رضیہ کے ہونٹوں میں جیسے تالا پڑ گیا تھا۔ اسے کچھ اس طرح محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی چالاک مداری دلچسپ کھیل دکھاتے دکھاتے درمیان ہی میں ہاتھ پھیلا کر لوگوں سے پیسے مانگنے لگا ہو اور سارا مزا کرکرا کر گیا ہو۔ اس کا دماغ بالکل جواب دے چکا تھا۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکتی تھی مگر اس نازک موقع پر بھی اس کے شاعر بھائی کی باتیں کام آئیں۔ اس نے لوہے کی ٹوپی اتار کر پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

”آزادی کا مطلب ہی یہی ہے کہ تمہیں درندوں سے بھرے ہوئے جنگل میں تنہا چھوڑ دیا جائے جہاں ہر قدم پر اپنی حفاظت تمہیں آپ کرنی پڑے۔“

اور وہ سوچتی اس کا بھائی سچ کہتا ہے۔ اسے واقعی درندوں کے درمیان تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ جنگل میں راستہ بھول گئی تھی۔ یہاں چاروں طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ یہاں کسی طرف سے بھی اچانک اس پر حملہ ہو سکتا تھا لیکن وہ درندوں کے درمیان نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں اور ویران بازاروں کی نالیوں میں گری ہوئی انسانی لاشوں کی بجائے انہیں کھلا روشن اور صاف ستھرا اور بارونق دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر وہ گندگی، غلاظت اور تعفن تو شہر کے اندر چلا آ رہا تھا۔ وہ تو ان کے اپنے گھر میں بھی پہنچ چکا تھا اور صحن میں گیندا، رتن جوت، موتیا اور عشق پیچاں کے سارے پھول ایک ایک کر کے مرجھا گئے تھے اور کومل پتیاں سوکھ کر کانٹے بن گئی تھیں۔ شہر میں ہزاروں نئی لائبریریاں اور بچوں کے کلب گھر کھلنے کی بجائے اس کا تین چوتھائی حصہ جل کر ملبے کا ڈھیر بن گیا تھا اور نئی خانقاہ ویران ہو گئی تھی۔ لائبریری کے برآمدے میں بیٹھ کر چرس اور بھنگ پینے والے مجاور نہ معلوم کدھر غائب ہو گئے تھے اور وہ گوالنیں، جن کے چوڑیوں والے دودھ بھرے بازو اپلوں کو جھنکار کے ساتھ دیوار کی طرف اچھالتے تھے، اپنی رہی سہی آزادی بھی کھو بیٹھی تھیں۔

کرفیو کھلنے پر جب کبھی وہ تیسرے یا چوتھے روز ڈری ڈری سہمی سہمی سکول کی سمت روانہ ہوتی تو اسے ہر پل دھڑکا سا لگا رہتا۔ اگرچہ شریف پورہ تک مسلم آبادی تھی اور کمپنی باغ میں تو کوئی آدمی دکھائی نہ دیتا تھا پھر بھی اسے ہر قدم پر اپنے ارد گرد درندوں کا احساس ہوتا جن کے درمیان آزاد ہونے کے بعد وہ تنہا چھوڑ دی گئی تھی۔ شہر کی فضا میں، جلی بجھی چیڑ کی لکڑیوں، گندھک، گندہ بیروزہ اور مٹی کے تیل کی ملی جلی تیز بو پھیلی رہتی تھی۔ اسے ہر چوک میں پولیس کی چوکی ڈیرے ڈالے، حقے پیتے، بالوں میں کنگھی کرتے اور مونچھوں میں تیل لگاتے ملتے۔ درختوں پر لٹکنے والے بورڈوں کی بجائے رضیہ کو اب وہاں سرخ سرخ زرد خوفناک نگاہیں اپنی طرف گھورتی دکھائی دیتیں۔ سکول میں سارا وقت دونوں فرقوں کی لڑکیاں ایک دوسرے سے کھنچی کھنچی سی رہتیں۔ سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح وہ معمولی سی آہٹ پر بھی چونک پڑتیں اور ایک دوسری کو معنی خیز نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ کمپنی باغ کا سہاگ اجڑ گیا تھا۔ درختوں کی کیاریاں، پودوں، پرانی عمارتوں اور خالی خالی بنچوں کو دیکھ کر اس محفل کا خیال آتا تھا جہاں لوگ اپنے کسی عزیز کو دفنانے کے بعد دری

پر بیٹھے اس کا سوگ منا رہے ہوں۔

روشیں، سڑکیں اور گھاس کے قطعے جھڑے ہوئے خشک پتوں سے اٹے پڑے تھے اور کوئی انہیں ایک جگہ اکٹھا کرنے والا نہ تھا۔ کیاریوں میں سجے ہوئے گملوں کے پھول رکھوالوں کے بغیر مرجھا گئے تھے۔ پرانی بارہ دری کے زنگ خوردہ گنبد پر آم کی ٹہنیاں لیٹے لیٹے جیسے دم توڑ گئی تھیں اور بھنوروں کی ٹولیوں نے کسی دوسرے دیس کی راہ لے لی تھی۔ فواروں کا پانی سوکھ گیا اور ان پر کائی جم گئی۔ اجڑے ہوئے راستوں پر گرے پڑے مردہ پتوں میں خزاں نصیب ہوا، منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی اور پرندے وہ مدھر راگ بھول گئے جنہیں کبھی وہ بہار کی سنہری فضاؤں میں، پھولوں سے لدی پھندی ڈالیوں پر جھولتے ہوئے گایا کرتے تھے۔ کلب گھروں پر ان مقبروں کا گمان ہونے لگا جہاں مقتول شہنشاہوں کی لاشیں دفن ہوں۔ اب وہاں کوئی افسر جوا کھیلنے نہ آتا تھا، کوئی خانساماں حاضری کے لیے موجود نہ تھا۔ رضیہ کا اسکول بند ہو گیا۔

لوگوں نے اپنے محلے سے باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ مسلم گھرانے غیر مسلم آبادی سے اور غیر مسلم، مسلمان محلوں سے کوچ کر گئے۔ کچھ گھرانے وہیں ختم کر دیے گئے اور باقی روتے پیٹتے گلیوں میں پھیل گئے۔ شہر مسلسل جل رہا تھا۔ بموں کے کبھی نہ رکنے والے دھماکوں اور رات دن گولیوں کی تیز اور کرخت آوازوں نے لوگوں کو نیم بہرہ اور نیم پاگل بنا دیا۔ جونہی یہ خبر پھیلی کہ امرتسر ہندوستان میں جا رہا ہے ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ اس سے پیشتر امرتسر کے ہر مسلمان کو یقین تھا کہ ان کا شہر پاکستان ہی کا ایک حصہ ہو گا لیکن اب جیسے ان کی کمر ٹوٹ گئی۔ شہر کے مختلف محلوں میں سے مسلمانوں نے آہستہ آہستہ نکلنا شروع کر دیا۔ رضیہ کے محلے کے اکثر گھرانے اپنا اپنا اسباب لاہور بھیجنے لگے۔ محلے کے چوہدری نے اپنی بہو اور دونوں بیٹیوں کا سارا جہیز اور دیگر سامان تین ملٹری لاریوں پر لاد کر لاہور روانہ کر دیا اور محلے کے غریب لوگ بیوقوفوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے اور یا پھر گھروں میں جا کر اپنی اپنی بہو بیٹیوں کا جہیز دیکھتے رہے۔ مگر ان کے لیے ٹرک کون لاتا؟ وہ محلے کے چوہدری نہ تھے اور ان کا کوئی رشتہ دار ملٹری میں کپتان نہیں تھا۔ یہ لوگ دوکانوں، بیٹھکوں اور مسجدوں میں محلے کی عورتوں اور بچوں کی عزت بچانے کے منصوبے باندھتے رہے اور محلے کے چوہدری اور بڑے گھر والے شال مرچنٹ کے گھر کی تمام عورتیں اور بچے لاہور چلے گئے۔ اب چوہدری کے لڑکے اور بڑے گھر والوں کے بیٹے، لہک لہک کر بندوق کندھے سے لٹکائے، لوگوں کو ترغیب دینے لگے کہ وہ اپنا گھر اور محلہ چھوڑ کر کہیں نہ جائیں، ہم یہیں پیدا ہوئے تھے اور یہیں مریں گے۔ لیکن لوگ دل ہار بیٹھے تھے۔ وہ حملوں کا مقابلہ ضرور کر رہے تھے مگر در پردہ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ امرتسر چھوڑنا ہی پڑے گا۔

رضیہ نے اپنے بھائی سے لاہور اٹھ چلنے کو کہا۔ مگر اس نے اس کی سخت مخالفت کی۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا' ہم اپنا گھر بار کیسے چھوڑ دیں۔ ہم اٹھ گئے تو ہندوستان کے باقی مسلمان کہاں جائیں گے؟"

اس نے ابا سے بھی ڈرتے ڈرتے بات کی۔

انہوں نے داڑھی کے بال دیکھتے دیکھتے سفید پڑ گئے تھے اور گالوں کی ہڈیاں ابھرنے لگی تھیں۔ انہوں نے کانپتا ہوا ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے کہا۔

"بیٹی' یہ ساری گڑبڑ پندرہ اگست تک ہی ہے۔ اس کے بعد دونوں حکومتیں اپنے اپنے ملک میں امن کر لیں گی۔"

اور ۱۵ 'اگست کے بعد جب دونوں حکومتوں نے اپنے اپنے ملکوں میں امن قائم کیا تو ڈوگرا اور سکھ ملٹری نے مسلمان محلوں پر کھلم کھلا حملے شروع کر دیئے۔ شہر کی مغربی آبادی ساری کی ساری شریف پورہ میں ہجرت کر آئی جو کیمپ قرار دے دیا گیا تھا۔ ادھر ادھر چند گلیوں کے لوگ بھاگ کر رضیہ کے محلے میں آ گئے اور گلی میں آدمیوں' عورتوں' بچوں اور صندوقوں کی بھرمار ہو گئی۔ ان کا محلہ شریف پورہ سے دور نہ تھا پھر بھی گلی کے نوجوان اپنے اپنے مورچوں پر ڈٹے رہے اور وہاں سے کوئی نہ ہلا۔ لیکن ملٹری کا مقابلہ کہاں تک؟ محلے میں گولی بارود ختم ہونے لگا' دشمن کے دس فائروں کے جواب میں ادھر سے محض ایک فائر ہونے لگا اور ایک دن ایک فائر بھی نہ ہوا اور ملٹری نے دروازے پر حملہ کر دیا۔ لوگوں کو آخری دم تک یقین تھا کہ لیگ کی لاریاں انہیں لینے' ان کے بال بچوں کی جان بچانے ضرور آئیں گی مگر سکھ ملٹری دروازے پر آ گئی اور لیگ کی لاریاں نہ آئیں۔ محلے میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ چیخ پکار' شور' آوازیں------

عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان' کوئی ننگے سر' کوئی ننگے پاؤں' گلی کے چور دروازے میں سے ہو کر شریف پورہ کی طرف بھاگنے لگے۔ بعض اسباب اٹھانے کی فکر میں تھے اور بعض اسباب وہیں چھوڑ جانیں بچا کر بھاگ رہے تھے۔

رضیہ بھی اپنے ماں باپ' بہن بھائیوں سمیت مکان کے تمام دروازے کھلے اور صندوق بغیر تالے کے چھوڑ کر گلی میں نکل آئی' وحشت زدہ لوگ' فق چہروں اور سوکھی ہوئی زبانوں سے ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے اور بدحواس ہو کر کوئی اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے تھا' کسی نے بوڑھی ماں کو کندھے پر لے رکھا تھا اور کوئی ٹرنک سر پر اٹھائے اکیلا ہی دوڑ رہا تھا۔ عورتوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور کسی ایک کے سر پر بھی برقع ٹھیک طرح نہ جما ہوا تھا۔ بس اسی کہرام کے عالم میں رضیہ نے اپنی سہیلی ثریا کو دیکھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ چہرے پر خون کا نام تک نہ تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے لوگوں کو تک رہی تھی۔ اس کا بوڑھا

باپ گنٹھیے کا مریض تھا۔ وہ دروازے کی دلیز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا اور بے کسی سے لوگوں کو شریف پورہ کی طرف بھاگتے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

اسے کون وہاں سے اٹھا کر ساتھ لے جاتا؟ ثریا کی آنکھوں میں آنسو سوکھ گئے تھے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں ہر ایک سے التجا کرتی کہ اس کے ابا کو بھی ساتھ لے چلو مگر کوئی اس کی فریاد پر کان نہ دھرتا۔ کسی کو اتنی فرصت نہیں تھی۔ تھکا ماندہ، بدنصیب بوڑھا انسان، اپنے مکان کی آخری سیڑھی پر بیٹھا، زندگی کے آخری موڑ پر بیٹھا، نحیف اور سوکھی ہوئی کراہ نما آواز میں اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا۔

”ثریا تم اپنی جان بچاؤ، تم شریف پورے چلی جاؤ، میں تو مر رہا ہوں۔“

اس میں بولنے کی ہمت نہ تھی، اٹھنے کی سکت نہ تھی اور گلی کا آہنی دروازہ ہتھوڑوں کی مدد سے توڑا جا رہا تھا۔ ثریا کا گلا رندھ گیا، اس کی آواز ڈوبنے لگی تھی۔ وہ ہر آدمی، ہر گزرنے والے سے التجائیں کر رہی تھی، ہاتھ جوڑ رہی تھی اور خون کے آنسو رو رہی تھی۔

رضیہ نے قریب جا کر اسے پکارا۔ ثریا نے گھوم کر اسے وحشت زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔ رضیہ کا بھائی اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے لپک کر رضیہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے زبردستی کھینچ کر لے گیا۔ ثریا روتی رہی، چیختی رہی اور اس کا کمزور بوڑھا باپ اسے نحیف آواز میں کہتا رہا۔ ”بیٹی بھاگ جاؤ، بیٹی بھاگ جاؤ۔“ اور ثریا کے ملتجی ہاتھوں نے ہر کسی کے دامن کو پکڑنے کی کوشش کی مگر جھٹک دیئے گئے اور معاً دروازے کا ایک پٹ دھڑام سے زمین پر آن گرا۔ رضیہ نے چور دروازے میں داخل ہونے سے پہلے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ ثریا اپنے گنٹھیے کے مریض بوڑھے باپ کو کمر پر لادے جھکی جھکی آہستہ چل رہی تھی اور اس کے عقب میں بپھرے ہوئے ہجوم کا سیلاب تلواریں، بلمیں، بندوقیں اور کلہاڑیاں لہراتا اس کی سمت تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ رائفل کے پے در پے تین چار فائر ہوئے۔ رضیہ کانپ گئی اور لپک کر چور دروازے میں داخل ہو گئی۔

شریف پورہ بالکل سامنے تھا۔ ان کے درمیان صرف تین فرلانگ لمبی سڑک حائل تھی۔ لڑھکتے ہوئے پہیوں کی طرح جنہیں کسی تیز رفتار گاڑی نے جھٹکا دے کر اپنے تلے سے سرکا دیا ہو، لوگ بدحواسی کے اور سراسیمگی کے عالم میں شریف پورہ کی طرف بگٹٹ بھاگ رہے تھے۔ اچانک ایک ملٹری ٹرک رام باغ کی طرف سے گولیوں کا مینہ برساتا ہوا آیا اور پل کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگ بدستور منہ اٹھائے بھاگتے رہے اور گولیاں انہیں ٹھنڈا کرتی گئیں اور وہاں ایک دوسرا محشر برپا ہو گیا۔ ماؤں کے ہاتھوں سے بچے اور بھائیوں کے ہاتھوں سے بہنیں چھوٹ گئیں۔ ہر شخص اپنی اپنی جان بچا کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ رضیہ نے اپنے شاعر بھائی کو پل پر سے کود کر بدرو میں چھلانگ لگاتے اور باپ کو سڑک کے کنارے پڑے ہوئے گوبر کے ڈھیر میں گم ہوتے دیکھا۔ وہ چیخ مار کر اس کی سمت بڑھی

اور ایک سپاہی کے بھدے بازوؤں نے اسے اٹھا لیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر زمین پر گر پڑی اور لوٹنے لگی۔ اس دفعہ بیک وقت دو آدمیوں نے اسے اٹھا کر میدے کی بوری کی مانند ٹرک میں پھینک دیا۔ وہ چیختی رہی، چلاتی رہی، ٹرک میں پاگلوں کی طرح لوٹتی رہی اور ٹرک سیدھی سڑک پر جالندھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اچانک اسے یوں لگا گویا کسی نے تیز دھار خنجر اس کے دل میں گھونپ دیا ہو اور اس کا بدن ایک دم سن ہو گیا، آواز مر گئی، حلق سوکھ گیا اور ہونٹ جم گئے۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ ٹرک کے تختے پر چت لیٹی ہوئی تھی اور تین چار سکھ ایک طرف کھڑے اسے وحشت ناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی اور بدن ایک بار پھر سن ہو گیا۔

دوسری بار جب اسے ہوش آیا تو وہ کرتار پور گاؤں میں حوالدار تخت سنگھ کے گھر، دالان میں بچھی ہوئی کھاٹ پر لیٹی تھی۔ اس کے اوپر پھیلے ہوئے نیم کے چھتناروں میں شام کی ہوا دھیمے سروں میں کراہ رہی تھی۔ ایک بھاری جسم والی عورت اسے پنکھے سے ہوا دے رہی تھی۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک گائے جگالی کرتے ہوئے اسے حسرت ناک نگاہوں سے تک رہی تھی۔ رضیہ کے ہونٹ خشک تھے، حلق سوکھا ہوا تھا اور آنکھیں حلقوں میں دیوانوں کی طرح گردش کر رہی تھیں۔ وہ کبھی گائے پر جاتیں اور کبھی پنکھا جھلنے والی عورت پر لوٹ آتیں۔

کبھی عورت -------کبھی گائے -------

گائے -------عورت -------عورت -------گائے -------

اور وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگی۔

ماں -------میری ماں -------میرا گھر -------

موٹی عورت پیار سے اس کے بال درست کرتے ہوئے اس پر جھک کر بولی۔

”بیٹی! اسے بھی اپنا ہی گھر سمجھو۔“

”بیٹی؟“

رضیہ کی پھٹی پھٹی بے رونق نگاہیں اس عورت کے چہرے پر جم گئیں۔ وہاں رحم، محبت اور بچوں ایسی معصومیت کی جھلک تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ماں اس کے پاس بیٹھی ہو اور وہ چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔

اس حادثہ کے ٹھیک چھ ماہ بعد رضیہ کی شادی حوالدار تخت سنگھ سے ہو گئی۔ اس دوران میں اس نے اپنی شروع ہونے والی زندگی

کی اونچ نیچ پر بھی جی بھر کر غور کیا۔ شروع میں اس نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

وہ کہاں جا کر رہے گی؟

جہاں وہ جا رہی تھی وہاں اسے کون اپنائے گا؟

اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا اسے کون پالے گا؟

وہاں اس بے گناہ بچے کو کوئی باپ نہ مل سکے گا۔۔۔۔۔۔ کوئی اسے قریب نہ پھٹکنے دے گا۔

پاک دامن عورتیں اس پر آوازے کسیں گی۔

ہر محفل میں اس پر انگلیاں اٹھیں گی۔۔۔۔۔۔

اور یوں وہ کوڑھ پھیلانے والی چھپکلی بن کر سانپ کے منہ میں چلی جائے گی۔

کوئی اسے اپنے سے الگ بھی نہیں کرے گا اور پاس بھی نہ آنے دے گا اور وہ خارش زدہ پلے کی طرح اپنے زخم لیے گلی گلی لوگوں کی نظروں سے چھپتی پھرے گی' کبھی یہاں' کبھی وہاں۔۔۔۔۔۔ کرتار پور گاؤں میں امرتسر نہیں تھا' لاہور نہیں تھا' کراچی نہیں تھا' اس کا گھر نہیں تھا' اس کی ماں' اس کا بھائی اور اس کی سہیلی ثریا نہیں تھی مگر اس بچے' اس بے گناہ معصوم کا باپ ضرور تھا جسے دو ملکوں کی آزاد بربریت نے جنم دیا تھا۔ وہ اس بچے کی ماں تھی۔ وہ اس بچے کی ماں بنا دی گئی تھی اور وہ اس بچے کو ضائع کر دینا کسی طرح بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔

اگر وہ اس معصوم بچے کا پیدا ہونے سے پہلے گلا گھونٹ بھی دے تو آخر کس کی خاطر؟

اس کا گھر بار اجڑ گیا تھا۔ ماں باپ' بہن بھائی چھن گئے تھے' کمپنی باغ ویران ہو گیا تھا اور شہروں کے باہر بہنے والے گندے نالوں کی غلاظت اور تعفن شہروں کے اندر گلیوں' بازاروں اور لوگوں کے گھروں اور لوگوں کے دلوں میں گھس گیا تھا اور انسان نے انہی گلیوں' انہی بازاروں' انہی شہروں اور انہی مکانوں کی سیڑھیوں پر' نالیوں' دہلیزوں پر دم توڑ دیا تھا اور دانتے کے آسمانی جہنم کا خونیں کھیل ایک بار پھر زمین کے اسٹیج پر کھیلا گیا تھا۔ اب ایک اور دانتے کی ضرورت تھی جو اپنی دوسری کتاب میں اس ارضی جہنم کا نقشہ کھینچے لیکن شاید اس کام کو ایک دانتے پورا نہ کر سکے کیونکہ یہ ایک جہنم نہیں تھا' یہ ایک لاش نہیں تھی' یہ لاتعداد جہنم تھے' یہ ان گنت لاشیں تھیں۔ ان کی تعداد لاکھوں سے نکل کر کروڑوں تک پہنچ چکی تھی اور دھرتی کی تین چوتھائی آبادی ان لاشوں کے تعفن اور سڑاند میں دم توڑ رہی تھی۔ رضیہ کو جڑ سے کاٹ دیا گیا اور وہ ایک مضبوط درخت کی مانند دھڑام سے زمین پر اوندھے منہ آن گری تھی۔ اب اس کا یہی فرض تھا کہ وہ اپنی مرجھائی ہوئی خشک شاخوں کو لوگوں کے حوالے کر دے تا کہ وہ اپنے چولہے گرم کر سکیں اور آگ تاپ سکیں اور رضیہ نے

فیصلہ کرلیا کہ وہ کرتار پور میں رہ کر اپنی آگ میں آپ ہی بھسم ہو جائے گی مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دے گی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے رخصت کر دیا جو کبھی اس کے سچے دوست اور غم خوار تھے۔ اس نے اپنی بوڑھی ماں کو رخصت کیا جس نے کبھی کوئی نماز نہ چھوڑی تھی، جو گھنٹوں مصلے پر بیٹھی تسبیح پھیرتی رہتی تھی اور جو بچوں کو دعا مانگ کر پھونکیں مار مار کر اٹھایا کرتی تھی۔

"لالی، اجی، انور، سعیدہ۔۔۔۔۔۔۔ اٹھو دن چڑھ آیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ رضیہ تم بھی اٹھو۔"

اس نے اپنے بوڑھے باپ کو رخصت کیا جسے یقین تھا کہ پندرہ اگست کے بعد امن قائم ہو جائے گا اور جس کے بال دنوں میں سفید پڑ گئے تھے اور ہڈیاں نکل آئی تھیں اور جس نے گولیوں سے بچنے کے لیے گوبر کے ڈھیر میں اپنے آپ کو چھپا لیا تھا۔

اس نے اپنے بھائی۔۔۔۔۔۔۔ شاعر بھائی سے اجازت مانگی جو اسے پیرس، لندن اور ماسکو کی باتیں سنایا کرتا تھا، جو ہر محلہ میں بچوں کے اپنے کلب گھر اور ہر شہر میں خوبصورت لائبریریاں اور لوگوں کو خوشحال دیکھنا چاہتا تھا، جسے شیکسپیئر کی نظموں کے ٹکڑے ازبر تھے، جو اس گناہ کی ٹوہ لگانا چاہتا تھا جس کی پاداش میں انسانوں نے انسانوں کو کرۂ ارض پر درماندہ، مفلس اور بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا اور جو دانتے کی طرح ایک کتاب میں ارضی جہنم کا نقشہ کھینچنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنی پیاری سہیلی ثریا کو الوداع کہی، جو اپنی نازک پیٹھ پر اپاہج باپ کا بوجھ لادے کمان کی طرح جھکی سب سے پیچھے چلی آ رہی تھی اور جس کے پیچھے بپھرا ہوا ہجوم تلواریں، بلمیں اور کلہاڑیاں لہراتا اس کی سمت بڑھتا چلا آ رہا تھا، جو شریف پورہ پہنچنا چاہتی تھی اور شاید کبھی شریف پورہ نہ پہنچ سکی ہو۔

الوداع۔۔۔۔۔۔۔ میری پیاری سہیلی، میری بدنصیب بہن!

الوداع۔۔۔۔۔۔۔ میری ماں، میرے باپ، میرے بھائی احسان، میرے شیکسپئر، میرے دانتے!

الوداع۔۔۔۔۔۔۔ وہ سڑک جو گندے نالوں کو جاتی ہے، نئی خانقاہوں کو جاتی ہے، امرتسر کو جاتی ہے، کمپنی باغ کو جاتی ہے اور پاکستان کو جاتی ہے۔

زندگی کے نئے اسٹیج پر نمودار ہونے سے پہلے وہ ان تمام دیرینہ ساتھیوں کے سامنے آخری بار جھکی، جنھوں نے زندگی کے ہر کھیل میں اس کا ساتھ دیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتی گئی، اور پیچھے، اور پیچھے یہاں تک کہ ان کے چہرے دھندلے ہوتے ہوتے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور اس نے اپنے آپ کو حوالدار تخت سنگھ کے حوالے کر دیا اور بے گناہ بچے کو باپ کی آغوش میں ڈال دیا۔

اور تخت سنگھ اس کے پاس ہی دوسری کھاٹ پر لحاف میں منہ سر لپیٹے خراٹے بھر رہا تھا۔

طاق میں جلتے ہوئے دیے کی لو مدھم ہو رہی تھی اور دیواروں پر تاریک سائے لمبے لمبے پردوں کی طرح لہرانے لگے تھے۔ بند کھڑکی کی درزوں میں سے پھیکی چاندنی کا نور دبے پاؤں اندر داخل ہو رہا تھا۔

رضیہ آہستہ سے لحاف ایک طرف سرکا کر اٹھی اور کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانکنے لگی۔

تازہ اور سرد ہوا کا ایک جھونکا اس کی پیشانی سے چھوا اور اسے یوں لگا گویا کسی نے اپنا ٹھنڈا ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا ہو۔ ٹیلے والے شیشم کے خشک پتے نرم ہوا میں رک رک کر گر رہے تھے۔

چاند۔۔۔۔۔ زرد زرد گول گول چاند مغربی درختوں کے جھنڈوں پر جھک گیا تھا اور کھیتوں میں سے ہلکی ہلکی دھند اٹھنے لگی تھی۔

دور دریا کے قریب اسے چند مشعلوں کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی اور ڈھول کی دھیمی دھیمی تھاپ سنائی دی۔ ہربنس کور کی برات آ گئی تھی۔ ہربنس کور جو اسے بڑی پیاری تھی اور جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے دلہن بنایا تھا۔ رضیہ بت بنی چند لمحوں تک ان روشنیوں کو دیکھتی رہی جو ڈھلتی رات کی تھکی تھکی پھیکی چاندنی اور کھیتوں میں پھیلی ہوئی دھند کے عقب میں سے ڈھول کی دھیمی تھاپ پر والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

وہ بالکل ساکت و جامد کھڑی تھی۔ معاً جیسے کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”رضیہ! بدنصیب رضیہ!! تیری بارات کب آئے گی؟“

اور وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اسے ہربنس کور سے محبت تھی مگر وہ اس کی بارات نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جیسے اس سے یہ حق بالکل چھین لیا گیا تھا۔ دوپٹے سے پلکوں پر آئے ہوئے آنسو پونچھ کر وہ اپنے خاوند حوالدار تخت سنگھ پر جھک گئی اور اسے آہستہ سے ہلاتے ہوئے بولی۔

”اٹھیے برات آ گئی ہے۔“

اور دلہن کے کمرے میں لڑکیاں ڈھولک پر گا رہی تھیں۔

”کنکاں لمیاں نی مائے
دھیاں کیوں جمیاں نی مائے؟“

◆ ◆ ◆

حسن اور روٹی

آرٹسٹ کمرے میں ایک طرف بچھی ہوئی کھاٹ پر الماری سے ٹیک لگائے کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ الماری کے اوپر والے دونوں خانے اردو انگریزی کی ضخیم کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ نچلے خانے میں پرانے رنگوں کے بدنما ڈبے، گھسے ہوئے برش، ادھوری اور بے رنگ تصویروں کے بوسیدہ خاکے، دو تین ٹوٹی پھوٹی پنسلیں، ربڑ، ایک تکونی پیمانہ اور ایک جیومیٹری بکس پڑا تھا۔ دیواروں پر جابجا سادہ اور رنگین تصویریں لٹک رہی تھیں۔ ان میں سے بعض فریم کی ہوئی تھیں اور بعض کو ویسے ہی کسی گتے پر چپکا کر لٹکا دیا گیا تھا۔ سامنے والی دیوار پر انگلستان کے مشہور ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیئر کی فریم کی ہوئی تصویر تھی۔ اس تصویر میں شیکسپیئر میز پر کہنی اور کاغذ رکھے ہاتھ میں قلم لیے کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کے عین نیچے آرٹسٹ کی بوڑھی ماں چرخے پر سوت کات رہی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ چرخے کی ہتھی گھما رہی تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ دھنکی ہوئی روئی کے نرم گالے کو تکلے کی نوک سے چھوا کر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف لے جاتی اور اس میں سے سوت کا باریک دھاگہ نکل کر تکلے سے لپٹ جاتا۔ گھوں------ گھوں------ گھوں!

چرخے کا مدھم شور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح کمرے کی اداس فضا میں گونج رہا تھا۔ کسی وقت اچانک سوت کا تار ٹوٹ جاتا۔ ماں کا تھکا تھکا سا ہاتھ وہیں رک جاتا اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ دفعتاً کہیں ڈوب جاتی۔ وہ سوت کے ٹوٹے ہوئے سروں کو لب لگا کر ایک دوسرے سے وٹ دیتی۔ دوپٹہ سر سے کھسک جاتا اور اس کے برف ایسے سفید بال نمایاں ہو جاتے جو کبھی سیاہ تھے جن میں کبھی زندگی کی چمک اور صندل کے گنجان جنگلوں کی خوشبو تھی لیکن جو وقت کے تکلے پر گھومتے گھومتے برف کی طرح سفید پڑ گئے تھے اور جن کی اجلی چمک پر گذرے ہوئے ماہ و سال کی پھیکی اور پژمردہ راکھ بکھر گئی تھی۔ زندگی کا دن ڈوب رہا تھا اور صندل کے گنجان جنگلوں میں رات کے پراسرار سائے سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔

ماں کے پاس ہی بچھے ہوئے بوریے پر آرٹسٹ کی چھوٹی بہن زیب جو پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی اور جس کا بوسیدہ دوپٹہ کئی جگہوں سے مرمت کیا ہوا تھا، دبی ہوئی آواز میں انگریزی کا سبق یاد کر رہی تھی۔

آہا، کتنا شاندار کیک ہے------ What A Big Cake

کیا میں اسے کھا لوں؟-------May I Have It

نہیں، تم اسے نہیں کھا سکتیں-------No, You Can't Have It

مگر زیب اسے کھانا چاہتی ہے۔ وہ اپنی ماں، اپنے آرٹسٹ بھائی اور اپنے بوڑھے نانا جان کے ساتھ اس گھر میں رات بھر سے بھوکی تھی۔ وہ کتاب کے صفحے پر بنے ہوئے کیک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے آج تک ایسا کیک نہیں کھایا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے، اسکول سے واپس آتے ہوئے، بیکری کی دوکانوں اور ہوٹلوں کی اونچی اونچی الماریوں میں سجے ہوئے ایسے ہی کیک زیب نے کئی بار دیکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر ہلکے سبز رنگ کا چھوٹا سا درخت بنا ہوتا تو کسی پر بڑا ہی پیارا تاج رکھا ہوتا۔ پہلے پہل وہ سمجھتی رہی کہ یہ بچوں کی ریشمی ٹوپیاں ہیں جن پر بیل بوٹے کاڑھے گئے ہیں، مگر ایک روز اس کی سہیلی سعادت نے جس کا باپ ایک ہوٹل میں بیرا تھا، بتایا کہ وہ بچوں کی ٹوپیاں نہیں ہیں بلکہ کیک ہیں جو کھائے جاتے ہیں اور زیب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ سوچنے لگی لوگ اتنے بڑے کیک ہاتھ میں لے کر کیسے کھاتے ہوں گے۔ جب وہ انہیں دانتوں سے کاٹتے ہوں گے تو اوپر لگا ہوا شیرہ اور مکھن ضرور ان کے ہونٹوں سے چپک جاتا ہوگا-------اور زیب نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر شیرے اور مکھن کو پونچھ لیا تھا۔ زیب ان ہوٹلوں کے پاس سے گزرتے ہوئے بڑے شوق سے ایک نگاہ اندر ڈالا کرتی۔ وہ اس نگاہ کو اپنا سفیر بنا کر ہوٹل میں داخل کر دیتی اور خود آگے نکل جاتی۔ وہ لوگوں کو میزوں کے گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے، چائے پیتے، کیک کھاتے دیکھتی اور اسے اپنا حلق سوکھتا محسوس ہوتا۔ کوئی کھانے کو غور سے جھک کر دیکھ رہا ہے، کسی نے کیک کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈال رکھا ہے اور اس کے جبڑے خچر کے جبڑوں کی طرح دہل رہے ہیں، کوئی انگلیاں چاٹ رہا ہے اور کوئی پھولی ہوئی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ڈکاریں لے رہا ہے۔

زیب یہ سب کچھ دیکھتی اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ جاتی۔ اس کے آرٹسٹ بھائی کی تصویریں بازار میں بہت ہی کم بکتی تھیں۔ مہینے میں بمشکل دو ایک بار ایسا ہوتا تھا کہ وہ کسی کمپنی کا کام حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور گھر میں دال بھات کا بندوبست ہو گیا۔ ورنہ ہر تیسرے دن فاقہ ہوتا تھا۔ یہ اس گھر کی پرانی ریت تھی۔ کم از کم جب اس کے ابا جان نے آنکھیں بند کی تھیں وہ یہی کھیل دیکھ رہی تھی۔

ہفتے میں کئی ایک بار اسے بغیر کچھ کھائے پیئے اسکول جانا پڑتا۔ اس دن اس کا جی پڑھائی میں ذرا نہ لگتا۔ وہ دن بھر سست اور نڈھال رہتی۔ آدھی چھٹی کے وقت جب دوسری لڑکیاں پھل بیچنے والی مائی کی دوکان سے کھٹی میٹھی گولیاں، املی بیر اور کچے آلوچے لے کر کھاتیں تو وہ اسکول کے پچھواڑے اگے ہوئے شہتوت کے درختوں میں چلی جاتی اور زمین پر گرے پڑے کچے پکے شہتوت اٹھا

اٹھا کر کھانے لگتی اور یا پھر بوڑھے مالی کو بڑی سی قینچی سے غیر ضروری پودوں کی کانٹ چھانٹ کرتے دیکھتی رہتی۔ اسکول لگنے کی گھنٹی ہوتی تو اس کا جی جیسے ڈوبنے لگتا۔ جماعت میں اس کے اور سبق دہراتی ہوئی استانی کے درمیان ایک ناقابل عبور فاصلہ حائل ہوتا تھا۔ اسے استانی کی آواز بڑی دور سے آتی سنائی دیتی۔ گویا وہ سکول کے پچھواڑے شہتوت کے درختوں کے درمیان کھڑی ہو جہاں کچے پکے شہتوت زمین پر ہر وقت پڑے رہتے تھے۔

واپسی پر شہر کے صدر دروازے میں پھلوں کی بڑی بڑی دوکانوں پر سجے ہوئے تازہ اور رسیلے پھلوں کے ٹوکرے دیکھ کر اس کا جی بے اختیار ان ٹوکروں میں گھس کر ہمیشہ کے لیے سو جانے کو چاہتا۔ خیال ہی خیال میں وہ پھلوں سے لدے ہوئے باغات میں پہنچ جاتی جہاں وہ سرد پانی کے ایک چھوٹے سے نالے کے کنارے ٹھنڈی گھاس پر بیٹھی ہے۔ اس کے سر پر خوشبودار درختوں کا سایہ ہے۔ اس کے ارد گرد درختوں کی ٹہنیوں پر امرود‘ آلوچے‘ ناشپاتیاں اور لوکاٹوں کے زرد زرد رس بھرے چمکیلے گچھے جھول رہے ہیں اور وہ جس ٹہنی کی طرف دیکھتی ہے وہ بڑے ادب سے جھک کر اپنے میٹھے میوے اس کی خدمت میں پیش کر دیتی ہے۔ اور وہ ان میووں کو ندی کے برفاب میں ڈبو کر بڑی رغبت سی کھا رہی ہے۔ گرم دھوپ میں صدر بازار میں ہلکی ہلکی گرد ہر وقت اڑتی رہتی اور فضا میں گھوڑوں کی لید اور پٹرول کی بو دن بھر پھیلی رہتی۔ مسجد کے ساتھ والی دوکان کا سیاہ اور اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھوں والا موٹا مالک گدی پر بیٹھا حقہ پیتے ہوئے‘ شوکیس میں رکھی ہوئی ڈبل روٹیوں‘ بسکٹوں‘ خطائیوں اور کیک کے زرد زرد ٹکڑوں کی ہر دم رکھوالی کیا کرتا۔ زیب کا جی چاہتا کسی روز وہ گزرے تو مونچھوں والا موٹا رکھوالا گدی پر لیٹا نیند میں خراٹے بھر رہا ہو۔ بازار اچانک سنسان ہو جائے۔ ہر آدمی اپنی جگہ جم جائے اور وہ چپکے سے شوکیس کا ڈھکنا اٹھا کر زرد زرد کیک کے ٹکڑوں کو کتاب کے تھیلے اور جیبوں میں ٹھونس کر بھاگ کھڑی ہو اور سیدھی گھر میں جا کر دم لے۔

اسے کیک کھانے کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں وہ لوگ عام طور پر گندم یا مکئی کی روکھی سوکھی روٹی کھاتے۔ کبھی ترکاری‘ کبھی شوربے‘ کبھی صرف پودینے اور کبھی محض پانی کے ساتھ ------ اور پھر مکئی بھی ختم ہو جاتی۔ دوکانوں پر پودینہ غائب ہو جاتا‘ آٹے والا کنستر خالی ہو کر کھڑکھڑانے لگتا‘ مسالے والا ڈبہ بند پڑا رہتا اور باورچی خانے میں چولہا ٹھنڈا پڑ جاتا اور وہ سکول میں شہتوت کے درختوں تلے گرے پڑے خاک آلود شہتوت اٹھا کر کھانے لگتی اور بیکری کے شوکیسوں‘ پھلوں کے ٹوکروں‘ ہوٹلوں کی الماریوں میں شیشوں کے پیچھے رسیلے پھل‘ خوش رنگ بسکٹ اور لذیذ کیک لہک لہک کر اچھلنے لگتے‘ ناچنے لگتے اور زیب کو مقناطیسی طاقت سے اپنی طرف کھینچنے لگتے‘ اسے خواب آلود لے میں نقرئی آوازیں دیتے۔

”آہا! ہم کتنے اچھے ہیں، ہم کتنے شاندار ہیں۔“

زیب سوکھے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہتی۔

”کیا میں ایک ٹکڑا کھا لوں؟“

اور کیک جواب دیتے۔

”نہیں، تم ہمیں کبھی نہیں کھا سکتیں! کبھی نہیں کھا سکتیں۔“

زیب بوریے پر بیٹھی انگریزی کا سبق یاد کر رہی تھی اور اس کی بوڑھی ماں چرخہ کات رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بھوک کی وجہ سے خود بخود پیدا ہونے والا اضمحلال، تھکن اور کسلمندی تھی، اس کے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں سی جم رہی تھیں جیسے مسلسل خشک سالی کے باعث دھرتی کے بنجر سینے پر دراڑیں پیدا ہو گئی ہوں اور قحط کے آثار نمودار ہو رہے ہوں۔ اس کی گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ یہ زمین کا رنگ تھا، بنجر زمین کا رنگ، بھوکی پیاسی زمین کا رنگ، چاروں طرف سے گدھوں کے لشکر اڈ رہے تھے، قحط آ رہا تھا، موت آ رہی تھی۔ بھوک پلیگ بن کر پھوٹنے کو تھی، زندگی کی طرب گاہوں میں موت ایک مسلسل ماتمی لے بن کر اس افق تک پھیل رہی تھی، یہ کیا ہو رہا تھا؟ یہ کیا ہونے والا تھا؟ آٹے کا کنستر خالی تھا اور الماری اردو انگریزی کی ضخیم کتابوں سے بھری ہوئی تھی اور زیب کے پاس ہی ایک پلنگڑی پر اس کے نانا جان گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے، سر جھکائے ہوئی ہتھیلیوں میں تھامے اونگھ رہے تھے۔ ان کی تاگے کی کمانیوں والی میلی عینک ان کی ناک پر نیچے تک کھسک آئی تھی، ان کا پوپلا منہ لٹکا ہوا تھا اور سر پر کنڈوں کی طرح اگے ہوئے بالوں کا رنگ راکھ ایسا ہو رہا تھا۔ وہ خود بھی بجھی ہوئی سرد راکھ کا ایک ڈھیر ہے جسے مدت ہوئی کوئی شنٹ کرتا ہوا انجن اپنی بھٹی سے خارج کر کے گزر گیا تھا۔ ان کی سوکھی ہوئی گردن پر نیلی رگیں ابھر آئی تھیں۔ انہوں نے بھی رات سے کچھ نہیں کھایا تھا اور وہ سر جھکائے، منہ لٹکائے نیم جان آنکھیں بند کئے کسی گرفتار پرندے کی طرح موت کی اونگھ میں ان روشن اور چمکیلے دنوں کا خواب دیکھ رہے تھے جب ہر ڈال پر پھولوں کی شمعیں روشن تھیں، جب ہر گھر میں بہار تھی، جب ایک روپے کا آٹا دو بار کر کے لانا پڑتا تھا اور جب ایک روپے کا گھی ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ جب ہر طرف امن و سکون تھا اور وقت کا دھارا سنہری کھیتوں میدانوں خیابانوں اور شاداب وادیوں میں چپ چاپ رواں دواں تھا۔ خواب ۔۔۔۔۔۔۔ محض خواب!

ان کے سر کے اوپر سفید دیوار پر زیب نے پنسل سے آڑے ترچھے لفظوں میں اردو املا کی مشق کی ہوئی تھی۔

ہمیشہ خدا کا شکر بجا لاؤ

سردیوں میں پھل مت کھاؤ

گرمیوں میں بھی پھل مت کھاؤ

ہم بڑے گدھے ہیں

خدا کا شکر بجالاؤ

------بقلم خود زبیدہ بانو کلاس پنجم

دروازے پر گرا ہوا ٹاٹ جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اس میں کئی ایک بڑے بڑے سوراخ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک میں سے باہر گلی والی سفید قبر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ یہ قبر گندی نالی کے کنارے پر واقع تھی اور یہاں ہر جمعرات کو لوگ موم بتیاں اور چراغ جلایا کرتے' بتاشے' چاول اور پھول چڑھایا کرتے تھے۔ پھول وہاں گندی نالی کی وجہ سے بدبو سے پڑے پڑے مرجھا جاتے اور موم بتیاں اور بتاشے لڑکے اٹھا کر لے جاتے اور چاول چڑیاں اور کوے چگ جاتے۔ اس کے بعد مزار اگلی جمعرات کے انتظار میں ویران پڑا رہتا۔ کبھی کبھی کوئی بوڑھی عورت یا مرد گزرتے ہوئے فاتحہ خوانی کر جاتا۔ پھول سوکھ جاتے اور ان کی گلی سڑی پتیوں کو گرم ہوا کے جھونکے ادھر ادھر سے اڑا کر گندی نالی میں جمع کر دیتے۔ آرٹسٹ نے ٹاٹ کے سوراخ میں سے دیکھا' قبر کے سرہانے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی' بدبو زیادہ ہونے کے باعث عورت نے ایک ہاتھ ناک پر رکھا ہوا تھا اور ایک ہاتھ سے دعا مانگ رہی تھی۔ دعا مانگ کر اس نے ہاتھ منہ پر پھیرا' بچے کھچے پھولوں کی مردہ پتیوں کو آنکھوں سے لگا کر وہیں رکھ دیا اور سلیپر گھسیٹتی ہوئی ایک طرف چل پڑی۔ دھوپ مکانوں کی آخری منزل پر پہنچ گئی تھی اور گلی میں گرمیوں کی گرم اور چمکیلی سہ پہر کی ویران سی خاموشی چھا رہی تھی مگر سامنے والے مکان کے دیوان خانے میں ٹھیکیدار کی ان پڑھ اور پیٹو لڑکیاں ابھی تک بازار سے پکوڑیاں اور کھٹے رس والے گول گپے منگا کر کھا رہی تھیں اور کھاتے ہوئے شور بھی مچا رہی تھیں۔ دوسرے مکان کے نچلے کمرے میں سبزی منڈی کے بڑے آڑھتی چوہدری نواب دین کا تکیہ نما دفتر تھا۔ چوہدری نواب دین ٹیلیفون پر اونچی اور تلخ آواز میں کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

"کیا؟------اچھا------پانچ من چقندر------اور------بیس من ادرک------کیا کہا؟
------ٹنڈے نہیں پہنچے------الو کے پٹھے!------پہنچ گئے------اچھا اچھا!"

آرٹسٹ کی نگاہیں شیکسپیئر کی تصویر کی طرف اٹھ گئیں۔ شیکسپیئر قلم ہاتھ میں لیے کہنیاں میز پر رکھے بدستور کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ کیا

سوچ رہا تھا؟ شاید ہلمت کا خاکہ تیار کر رہا ہو۔ شاید میکبتھ کا ڈھانچہ کھڑا کر رہا ہو یا شاید جولیٹ کی شیریں زبان سے محبت کی کوئی آسمانی تفسیر پیش کرنا چاہتا ہو۔ ہملٹ میکبتھ رومیو جولیٹ ۔۔۔۔۔۔ ایکٹ پہلا' ایکٹ دوسرا' ایکٹ تیسرا' شیکسپیئر پانچواں ایکٹ لکھ رہا تھا اور چوہدری نواب چقندر کا پانچواں من تلوا رہا تھا۔ شیکسپیئر اور چوہدری نواب دین میں بہت کم فرق ہے۔

ایک نے انسانوں کو ہملٹ میکبتھ اور رومیو جولیت دیا تو دوسرے نے چقندر' ادرک' ٹنڈے مولیاں دیں۔ ہملٹ اور ادرک ۔۔۔۔۔۔ ایک ذہنی توازن کی تلقین کرتا ہے' دوسرا ہاضمہ درست کرتا ہے۔ ایک پختہ لیکن غیر مرئی رنگوں کا طلسمی جال ہے اور دوسرا پکے ہوئے دھان کی خوشبو ہے۔ وہ قوس قزح کی رنگین کمان ہے اور یہ زرخیز زمینوں میں دھنسے ہوئے تیر ہیں' ہلوں کے تیز اور نوکیلے پھل ہیں اور ہل چلے کھیتوں میں دور تک ابھری ہوئی قطاریں ہیں جن میں پانی چمک رہا ہے۔

آرٹسٹ کی نگاہیں کتاب پر پلٹ آئیں۔ گھوں گھوں ۔۔۔۔۔۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ آٹے والا خالی کنستر کھڑ کھڑا رہا تھا اور چوہدری نواب دین چقندر بوریوں میں بھرنے کے بعد بیس من ادرک تلوا رہا تھا شیکسپیئر سوچ رہا تھا اور باورچی خانے میں چولہا ٹھنڈا تھا اور الماری میں اقبال کی بانگ درا اور جاوید نامہ خاموش تھے' آرنلڈ کا نور مشرق بجھ رہا تھا۔ کیٹس کے رنگین شعر چپ تھے۔ جبران کے فلسفیانہ نکات مہر بہ لب تھے' ہر شے چپ تھی' خاموش تھی' مردہ تھی' ہمہ تن فریاد تھی اور بوڑھا نانا پوپلا منہ لٹکائے بدستور اونگھ رہا تھا۔

بھگوان بدھ نے کہا۔ ''زمین سب کے لیے اناج پیدا کرتی ہے۔ اگر انسان پینے میں ایک دوسرے سے اشتراک کریں تو دنیا کتنی حسین ہو جائے۔''

اور ماں خاموشی سے سر ایک طرف جھکائے سوت کاتتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کیا جواب دیتی۔ اس کے لیے کسی نے اناج نہ پیدا کیا تھا' اس سے کسی نے کھانے پینے میں اشتراک نہ کیا اور خلیل جبران نے جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر انگلی آسمانی انداز میں ہوا میں اٹھا کر بھوکے اور بدحال لوگوں کو خطاب کیا۔

''کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم کچھ نہ کھاتے اور محض زمین کی خوشبوؤں کے سہارے زندہ رہتے۔''

نانا جان اونگھتے رہے' خوشبوؤں کے سہارے زندہ رہنے کے لیے ایک جنت کی ضرورت ہے اور جنت نیک آدمیوں کو ملتی ہے۔ وہ نیک جو مر جاتے ہیں اور نانا جان ابھی زندہ تھے اور زمین پر کہیں بھی جنت نہیں جہاں آدمی محض خوشبو سونگھ کر زندہ رہ سکے۔ اس جہنم میں زندگی کی بھٹی کو ہمیشہ گرم رکھنے کے لیے روٹی کی ضرورت ہے۔ تخلیق حرکت سے پیدا ہوتی ہے اور حرکت روٹی سے ۔۔۔۔۔۔

اور بھوک ان دونوں چیزوں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

آرٹسٹ نے بانگ درا کھولی۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا

آہا! کتنا اچھا کیک ہے۔

کیا میں اسے کھالوں؟۔۔۔۔۔۔۔نہیں، تم اسے نہیں کھا سکتیں۔

زیب اب قدرے اونچی آواز میں سبق دہرانے لگی تھی۔ وہ کیک والے فقروں کو بار بار کیوں دہرا رہی ہے؟ اسے یہ فقرے یاد کیوں نہیں ہوتے؟ اسے خاموشی سے پڑھنا چاہیے اور کیک کے خیال کو ذہن سے نکال دینا چاہیے۔ اسے کیک کی بالکل ضرورت نہیں، اسے محض خوشبوؤں کی ضرورت ہے، اسے محض خوشبوؤں پر زندہ رہنا چاہیے۔ وہ نیک ہے اسے مرجانا چاہیے۔ کیک کی خوشبو، پھلوں کی خوشبو، انگوروں کی خوشبو، ناشپاتیوں کی خوشبو اور ادرک ٹنڈوں اور چقندروں کی خوشبو۔

آرٹسٹ نے بیڑی سلگائی اور لمبا کش لیا۔ کڑوا دھواں اس کے خالی معدے سے یوں لگا گویا کسی نے تازہ زخم پر ٹنکچر آیوڈین کی شیشی انڈیل دی ہو۔ وہ چھاتی مسوس کر رہ گیا۔ اسے خیال ہوا اس نے بھی رات سے کچھ نہیں کھایا، صبح وہ صوبے بھر کے مصوروں کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوا تھا، وہاں گھنٹوں فن کے بدلتے ہوئے رجحانات کی افادیت پر بحث ہوئی۔ فن کو زیادہ سے زیادہ عوامی مسائل کا ترجمان بنانے کے متعلق قراردادیں پاس ہوئیں۔ پرجوش تقریریں ہوئیں۔ فن عوام کی امانت ہے، ہمارا فرض برش اور رنگوں کی مدد سے ان نقوش کو ابھارنا ہے جو عوام کے دلوں کے پاس ہو کر گزرتے ہیں۔ ہمیں لٹی ہوئی انسانیت کی ویران مانگ میں پھر سے سہاگ کا سیندور بھرنا ہوگا۔ ہم نئی زندگی کے عکاس ہیں۔ ہمارے فن کی جڑیں عوام کے دلوں میں ہیں۔ ہمارا فن ہم سے قربانی مانگتا ہے، خون مانگتا ہے۔

اور وہ کرسی پر بے اختیار کھڑا ہو کر چیخنا چاہتا ہے۔ ہمارے پاس خون کہاں؟ خون کسی کے پاس بھی نہیں، نہ میرے پاس نہ میری زیب کے پاس، نہ میری ماں کے پاس اور نہ بوڑھے نانا کے پاس۔ خون کہیں بھی نہیں، خون روٹی سے پیدا ہوتا ہے اور ہم بھوکے ہیں۔ ہمیں روٹی چاہیے۔ روٹی جو فن کا منبع ہے، اس کی روح ہے۔ جب روٹی اور فن ملتے ہیں تو انسان تاج محل تعمیر کرتا ہے، اہرام مصر بناتا ہے، الحمرا کے طلسماتی محلات کی بنیاد ڈالتا ہے، کالی داس ''شکنتلا''، ملٹن ''گمشدہ جنت'' اور اقبال ''جاوید نامہ'' لکھتا ہے اور اکبر ایک نئے مذہب کا پرچار شروع کرتا ہے۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ ایک آگ ہے، دوسرا پانی۔ دونوں کا ملاپ حرکت اور تخلیق کا پیش خیمہ ہے۔

لیکن جب فن سے روٹی بچھڑ جاتی ہے تو شکنتلا مر جاتی ہے' جاوید نامہ ردی میں بکنے لگتا ہے' پھر حسن مر جاتا ہے' فن مر جاتا ہے' مذہب مر جاتا ہے' بھوک سب کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ فن اکیلا رہ کر سب کو ہلاک کر دیتا ہے۔

فن عوام کی امانت ہے۔ ہمیں روٹی دیجئے' ہم فن کو خون دیں گے۔ مگر وہ اپنی کرسی پر خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بالکل نہ بولا۔ جب اجلاس ختم ہوا اور دوسرے عوامی فنکار ایک قریبی ریستوران میں گھس گئے تو وہ سر جھکائے گھر چلا آیا۔ اس کا بدن جل رہا تھا۔ وہ اب بھی کتاب دیکھ رہا تھا اور گلی میں دن ڈھل رہا تھا۔ اس کی ماں سوت کات رہی تھی۔ سوت کا نیا نیا کچا تار بار بار ٹوٹ جاتا اور اسے چرخہ روک کر اس کے سرے ملا کر بٹنا پڑتا۔

زیب۔۔۔۔۔۔۔ اس کی معصوم بہن' ادھ کھلا پھول بہار آنے سے پہلے ہی مرجھا رہا تھا اور نانا جان' بھوکا اور بوڑھا انسان موت کی گود میں اونگھ رہا تھا۔

اچانک دروازے کا ٹاٹ ایک طرف اٹھا اور اس کی بہن' آپا عطی اندر داخل ہوئی۔ وہ کئی دنوں بعد ان کے ہاں آئی تھی۔ ماں کا ہاتھ چرخے کی ہتھی پر گھومتے گھومتے ایک دم رک گیا اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ بند ہو گئی۔ زیب کتاب زمین پر اوندھی کر کے اٹھی اور آپا عطی سے لپٹ گئی۔ نانا جان کی اونگھ ٹوٹ گئی۔ انہوں نے آہستہ سے بوجھل سر اٹھا کر عینک کے گدلے شیشوں کے پیچھے سے اپنی زرد زرد بے نور سی آنکھوں سے آپا عطی کو دیکھا اور ان کے جھریوں بھرے چہرے پر درد انگیز تبسم کی دھندلی اور مبہم لکیریں پھیل گئیں' وہ تبسم تھا یا درد کا اظہار؟ شہد تھا زہر؟ آرٹسٹ بالکل نہ سمجھ سکا۔ ماں نے اٹھ کر اپنی بیٹی کو گلے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے جنہیں اس نے دوپٹے کے کونے سے پونچھ ڈالا۔ آپا عطی اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تم تو جیسے گھر کے ہو کر رہ گئے۔ کبھی بہن کو بھی یاد کر لیا کرو۔“

آرٹسٹ شرما کر مسکرانے لگا۔ آپا عطی پلنگڑی پر بیٹھ کر نانا جان کے شانے دبانے لگی۔ آپا عطی کے ساتھ ایک دبلی پتلی سی لڑکی بھی اندر داخل ہوئی تھی۔ یہ لڑکی برقع ایک طرف رکھے ماں کے پاس ہی پیڑھی پر بیٹھی تھی اور مدھم آواز میں اس سے باتیں کر رہی تھی۔ ماں نے پوچھا۔

”اب کچھ دن رہو گی نا؟“

”جی ہاں' ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ٹھہروں گی۔“

”گوجرانوالہ میں بھی گرمی کافی ہو گی۔“

”جی ہاں‘ کافی گرمی تھی۔“

اس لڑکی کا رنگ زردی مائل تھا۔ کیک کا رنگ۔ اس کی قمیض پر ہلکے عنابی رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ زیب کتاب ہاتھ میں پکڑے اس پھولدار کپڑے کو بڑے شوق سے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ لڑکی بڑی بڑی سرگیں آنکھوں سے دیوار سے لگی ہوئی تصویروں کو تکنے لگی تھی۔ آرٹسٹ کی نگاہیں کتاب پر جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے ذہن میں خالی کنستر کھڑکھڑا رہا تھا۔ ماں نے آپا عطی سے باتیں کرتے ہوئے دو ایک بار اس کی طرف پریشان اور متفکر نگاہوں سے دیکھا لیکن آرٹسٹ کی آنکھیں بدستور کتاب پر جھکی رہیں۔ وہ بدستور ورق گردانی کرتا رہا۔

”کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم کچھ نہ کھاتے اور محض زمین کی خوشبوؤں۔۔۔۔۔۔“

آرٹسٹ نے بیڑی کا کش لے کر سوچا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر یہ مہمان اس وقت نہ آتے۔۔۔۔۔۔ اس کے لیے آپا کے ساتھ گھر میں ایک اجنبی لڑکی کا آنا جسے وہ زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو اس وقت ایک اہم بات بھی تھی اور غیر اہم بھی۔ آرٹسٹ نے ایک لمحہ کے لیے لڑکی کی پراسرار سرگیں آنکھوں پر ڈھلکی ہوئی پلکوں کے جھکاؤ اور گردن کے نازک خم میں کوئی جمالیاتی تناسب پیدا کرنے کی کوشش کی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا خیال اپنی بوڑھی ماں کی طرف پلٹ گیا جس کا زرد چہرہ بھوک اور زردی کے باعث لاغر ہو رہا تھا اور جس کی غیر سرگیں آنکھوں میں زندگی کی چمک دم بدم بجھ رہی تھی۔ یہ خیال کہ اس کی ماں اور دوسرے گھر والے رات بھر سے بھوکے ہیں‘ سانپ بن کر اس کی روح کو ڈسنے لگا۔ اس کی زہر آلود نگاہوں کے آگے ایک تاریک پردہ سا کھنچ گیا اور دوسرے لمحے آپا عطی اور ولیم شیکسپیئر کی تصویر اور جاوید نامہ اور نور مشرق‘ ہر شے ہر چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ لڑکی بھی جس کا رنگ زرد زرد کیک ایسا تھا‘ جس کی قمیص پر ہلکے عنابی رنگ کے بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے اور جس کی سرگیں آنکھوں پر ڈھلکی ہوئی پلکوں اور نازک گردن کے لطیف خم میں اس نے کوئی جمالیاتی تناسب پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ پردہ۔۔۔۔۔۔ اس نے سوچا‘ بھوک مفلسی اور بے بسی کی وہ دیوار چین تھی جس نے اس کے اور اس کے فن کی عظمت کے درمیان حائل ہو کر اسے پستی‘ ذلت گمراہی اور بدذوقی کے صحرائے اعظم میں بھٹکنے کے لیے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا۔

مسجد میں موذن کی آواز بلند ہوئی اور ٹھیکیدار کے دیوان خانے میں ان پڑھ چٹوری لڑکیوں کا شور دھیما پڑ گیا۔

”اللہ بہت بڑا ہے۔۔۔۔۔۔ اللہ بہت بڑا ہے“

صحرائے اعظم دنیا کا سب سے بڑا ریگستان ہے۔ دیوار چین سب سے لمبی دیوار ہے اور انسان بڑا ہی ذلیل جانور ہے۔ یہ بڑی

ہی کچی عمارت ہے اسے ایک دن روٹی نہ ملے تو اس کی بنیادیں کھسکنے لگتی ہیں' حسن آرٹ اور فن بھاپ بن کر اڑنے لگتا ہے۔ یہ بڑا ہی پیٹو جانور ہے۔ اسے بھوک ستاتی ہے تو بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر سرکشی کا شعلہ ہر دم فروزاں رہتا ہے' اس کے لیے جہنم ہی سب سے اچھا مقام ہے۔ یہ جہنم دنیا میں بھی اسی کا حصہ ہے اور آخرت میں بھی اس کا انتظار کر رہا ہے۔ یہ بڑا چغل خور ہے' بڑا ذلیل ہے' بڑا بھوکا ہے' بڑا چھوٹا ہے۔

اللہ بہت بڑا ہے۔۔۔۔۔۔۔اللہ بہت بڑا ہے

آرٹسٹ چپکے سے اٹھا اور باہر نکل آیا۔

باہر دن چھپ رہا تھا۔ بازاروں میں دوکاندار اپنی دوکانوں کے آگے پھیلے ہوئے سائبان لپیٹ رہے تھے۔ لوگ ہلکے پھلکے کپڑوں میں ملبوس اپھرے ہوئے کبوتروں کی طرح اینٹھ اینٹھ کر چل رہے تھے۔ ہوٹلوں کے لاؤڈ سپیکروں پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے۔ تانگے موٹریں اور سائیکل تیز رفتاری سے شور مچاتے گزر رہے تھے۔ آرٹسٹ کو یوں لگا جیسے وہ کسی درمیانے قسم کے ہوٹل میں آ گیا ہو اور ہوٹل کے ملازم چیخ چیخ کر ایک پلیٹ قورمہ' دو پلیٹ بریانی' ایک پلیٹ مٹر گوشت' دو چائے لانا' جلدی لانا ۔۔۔۔۔۔کا شور مچا رہے ہوں۔ وہ اس سڑک پر ہو لیا جو شہر سے باہر چلی گئی تھی۔

تھوڑی دور چل کر شہر کے باغات آ گئے۔ جہاں درختوں کے سائے گھنے ہو رہے تھے اور گھاس پر بیٹھے ہوئے لوگ تلی ہوئی پوریاں' تلے ہوئے چنے اور ابلے ہوئے آلو کھائے جا رہے تھے یا کہیں تاش وغیرہ کھیل رہے تھے۔ روشوں پر جابجا چیونٹیوں سے لتھڑے ہوئے جھوٹے پتر' خالی اور مسلی ہوئی سگریٹ کی ڈبیاں' گنڈیریوں کے چھلکے اور پان کی پیکوں کے سرخ نشان بکھرے ہوئے تھے۔ گنجان درختوں میں اداس شام کی دکھ بھری خاموشی جیسے سسکیاں بھر رہی تھی۔ آرٹسٹ کو ہر درخت' ہر پودا' ہر روش ویران دکھائی دے رہی تھی۔ کسی جگہ بھی سچی خوشی' اطمینان اور حسن نہ تھا۔ اسے ہر شے اپنے حال پر آنسو بہاتی نظر آ رہی تھی۔ باغ کافی پیچھے چھوڑ کر آرٹسٹ تھک ہار کر ایک سڑک کے کنارے ایک ندی کے پل پر بیٹھ گیا۔ ندی خشک تھی اور جھڑے ہوئے خشک پتوں سے اٹی ہوئی۔ اس کے اوپر پھیلے ہوئے درخت کی گھنیری شاخوں میں چڑیاں شور مچا رہی تھی۔ اسے وہ آوازیں المناک چیخوں سے ملتی جلتی معلوم ہوئیں' جیسے ان چڑیوں کی کوئی ملکہ چڑیا مر گئی ہو اور وہ اس کی لاش گھونسلے میں رکھے رو رہی ہوں' اس کا ماتم کر رہی ہوں۔

بائیں طرف دور تک پھیلے ہوئے ہموار کھیتوں میں گیہوں کی فصل پک کر بالکل تیار کھڑی تھی۔ مغرب کی سمت چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کے عقب میں سورج چھپ گیا تھا اور آسمان پر پھولی ہوئی شفق کی سرخی نیم دائرہ ایسی آنکھ سے مشابہ تھا جس میں سرخ ڈوریاں مسلسل

رونے کی وجہ سے کھچ گئی ہوں۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ چند ایک کسان اپنے گھروں کو واپس ہو رہے تھے۔ کسی وقت وہ کوئی دردناک تان اڑا دیتے اور شام کی اداسی اور ویرانی زیادہ بوجھل اور گھناؤنی ہو جاتی۔

آرٹسٹ نے شفق کی سرخ آنکھ کو دیکھا' گیہوں کے نئے نئے اچھوتے خوشوں پر شام کو اپنا ملگجا آنچل پھیلاتے ہوئے دیکھا' نرم جھونکوں میں خوشبوؤں کو سونگھنا چاہا' پرندوں کی چہکاروں میں خوشی کے گیت تلاش کرنا چاہے لیکن اسے کچھ نہ مل سکا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ہر شے ختم ہو چکی ہے' ہر شے مر چکی ہے۔ کائنات کبھی نہ ختم ہونے والا ایک طویل اور بے معنی سفر ہے اور زندگی ملبے کے ڈھیر میں سے برآمد کی ہوئی گلی سڑی لاش ہے اور وہ کھلے کھیتوں کے درمیان ایک ندی کے پل پر نہیں بلکہ کسی کباڑیئے کی دوکان میں بیٹھا صدیوں کا کوئی بوسیدہ اخبار پڑھ رہا ہے۔ اس نے جھنجھلا کر اخبار پرے پھینک دیا اور واپس گھر کی طرف چل پڑا۔ بھوک کی وجہ سے انتڑیاں اس کے پیٹ میں چبھ سی رہی تھیں۔ دن شام سے آخری بار گلے مل رہا تھا۔ درختوں کے جھنڈوں میں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ مگر کھلی جگہوں پر ابھی ملگجی سی چمک باقی تھی۔ وہ ایک ایسی پتلی سی سڑک پر جا رہا تھا جس کے دونوں جانب خوشنما کوٹھیوں کے پچھواڑے بھدے لگتے تھے۔ جگہ جگہ باورچی خانوں میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور فضا میں گرم مسالوں کی خوشبوؤں کے باعث اسے چھینک آیا چاہتی تھی۔ ایک جگہ آرٹسٹ اچانک رک گیا۔

سامنے والی کوٹھی کے پچھواڑے ایک عورت پلیٹ میں سے کوئی شے مٹھیاں بھر بھر کر نکال رہی تھی اور اسے مرغیوں کے ڈربے میں ڈال رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کی تھی اور لباس سے خادمہ معلوم ہو رہی تھی۔ آرٹسٹ کو جانے کیا سوجھی' جب وہ عورت وہاں سے ہٹ کر کوٹھی کی پرلی طرف غائب ہو گئی تو وہ آہستہ سے احاطے کے جنگلے پر سے کودا اور دبے پاؤں مرغیوں کے ڈربے کے پاس پہنچ کر رک گیا۔ مرغیاں اسے دیکھ کر ڈر گئیں اور کٹ کٹ کرنے لگیں۔ وہ ایک پل کے لیے دم سادھے چپ چاپ کھڑا رہا اور دیدے گھما کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ ارد گرد کوئی آدمی اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ آگے بڑھا اور ڈربے کی سلاخوں پر جھک کر غور سے دیکھنے لگا۔ مرغیاں سمٹ کر ایک طرف جا کھڑی ہوئیں اور ننھے منے سفید چوزے سہم کر اپنی ماؤں کے پروں میں دبک گئے۔

آرٹسٹ کے نتھنوں میں پلاؤ کی گرم گرم خوشبو گھس گئی۔ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں اور نتھنے پھول گئے۔ کونے میں اس کے پاس ہی تام چینی کی ایک پلیٹ میں شوربے میں بھیگے ہوئے گلابی رنگ کے چاولوں کی ڈھیری سی لگی تھی۔ آرٹسٹ کے تمام حواس بیدار ہو گئے۔ اس نے احتیاط سے ڈربے کا دروازہ کھول کر اپنا ہاتھ پلاؤ سے بھری ہوئی پلیٹ کی طرف بڑھایا۔ ایکا ایکی جیسے کسی نے اس کا ہاتھ اپنی آہنی گرفت میں لے لیا۔ اس کا سارا بدن ایک دم پسینے میں ڈوب گیا' ہاتھ جلدی سے پیچھے کھینچ کر اس نے ننھے منے چوزوں کی

طرف دیکھا جو سہمی ہوئی نظروں سے تک رہے تھے۔ ان کی معصوم اور بے زبان نگاہوں میں التجا اور فریاد تھی۔ ان چوزوں کو دیکھ کر اسے اپنی معصوم بہن زیب کا خیال آ گیا۔

آہا! کتنا شاندار کیک ہے۔

کیا میں اسے کھا لوں؟

آرٹسٹ کے چہرے پر ندامت کا خیال ملائم اسی احمریں چمک بن کر جھلکنے لگا۔ اسے اپنے آپ پر مجرم ہونے کا گمان ہوا، جیسے وہ ریل گاڑی میں بغیر ٹکٹ سفر کرتے پکڑا گیا ہو۔ اس نے پلاؤ سے بھری ہوئی پلیٹ چوزوں کی طرف بڑھا دی۔

"ہاں، تم اسے کھا سکتی ہو میری زیب، میرے ننھے منے چوزو! یہ تمہارا حصہ ہے، یہ تمہارے لیے ہے۔"

اور وہ کوٹھی کے احاطے سے نکل کر چپ چاپ ایک طرف روانہ ہو گیا اور بہت جلد رات کے اولین اندھیروں نے اسے اپنے اندر جذب کر لیا۔

دوسرے ہی دن آرٹسٹ کو بالکل غیر متوقع طور پر ایک جگہ سے اپنی کسی تصویر کے پیسے مل گئے۔ شام کے بعد وہ خوب اچھی طرح سے نہا کر کپڑے پہنے، سگریٹ سلگائے گھر سے نکلا اور سیدھا آپا عظمیٰ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ آپا کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ محض گھر میں ہی نہیں بیٹھا رہتا بلکہ باہر نکل کر لوگوں سے ملتا جلتا بھی ہے۔ بازاروں میں اسے ہر راہ گیر پر ایسے آدمی کا گمان ہوا جو پھولوں کا ہار ڈالے کسی برات کے ساتھ مزے مزے سے قدم اٹھاتا جا رہا ہو۔ مشرق کی طرف چاند طلوع ہو رہا تھا اور مکان کی چھتوں، گیہوں کے پکے ہوئے خوبصورت کھیتوں اور لوگوں کے چہرے پر اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی ملائم روشنی بکھیر رہا تھا۔ خنک ہوا کے جھونکے قسم قسم کی خوشبوؤں سے بوجھل ہو رہے تھے۔ عظمیٰ آپا کے پاس پہنچ کر وہ چھوٹے بھانجے کو گود میں لے کر دیر تک پیار کرتا رہا۔ وہ کائنات کی ہر شے کو اپنی گود میں لے کر بڑی محبت سے پیار کرنا چاہتا تھا۔ زندگی اسے ایک مسلسل بوسہ معلوم ہو رہی تھی طویل اور کبھی ختم نہ ہونے والا محبت کا اولین شہد آگیں بوسہ-------

آپا صحن میں بیٹھی پان لگا رہی تھی وہ اس کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا کہ ایک لڑکی اوپر کی منزل سے اتر کر نیچے صحن میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی مخملی ڈبیا تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ذرا سمٹی اور پھر بڑی شان سے چلتی ہوئی عظمیٰ آپا کے پاس آ کر ڈبیا کھول کر کچھ دکھانے لگی۔

"دیکھئے، بالکل ایسی ہی انگوٹھی تھی۔"

آرٹسٹ دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔ لڑکی کی آواز نازک اور مترنم تھی، اس کا رنگ سپید تھا اور اس میں ہلکے سنہرے پن کی دلکش آمیزش تھی، جیسے کچے دودھ میں جنگلی شہد حل کیا گیا ہو، جیسے سنگ مرمر کی بارہ دری میں شفق کا سونا چمک رہا ہو، جیسے سفیدے کے جنگلوں میں شام رہی ہو۔ اس کی بسنتی وائل کی قمیص پر ہلکے عنابی رنگ کے بڑے بڑے خوبصورت پھول بنے ہوئے تھے اور سفید ساٹن کی شلوار کے نیچے سفید سینڈل بڑے آرٹسٹک انداز سے میچ کر رہا تھا۔ قمیض کے پھولوں کے رنگ کا جالی دار دوپٹہ اس کے شانوں پر ڈھلکا ہوا تھا اور سیاہ بالوں کی گندھی ہوئی دو چوٹیاں اس کی چھاتیوں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ چست لباس میں سے اس کے نازک بدن کا تناسب دائروں، نصف دائروں، قوسوں اور لطیف خموں کا ایک حیرت انگیز امتزاج پیش کر رہا تھا جیسے وہ کوئی اپسرا ہو۔ آکاش کے نیلگوں خلاؤں میں اڑنے والی کوئی دیوی ہو جو گھڑی دو گھڑی کے لیے زمین میں بسنے والے درد کے ماروں کے درمیان ان کا جی بہلانے اتر آئی ہو۔

جب وہ اپسرا مخملی ڈبیا ہاتھ میں تھامے پھر اوپر چلی گئی تو آرٹسٹ دیر تک اس کے قدموں کے ساتھ بج اٹھنے والے گھنگھروؤں اور خلخالوں کی شیریں آواز سنتا رہا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں گولڈ فلیک کا کش لیتے ہوئے آپا عطی سے پوچھا۔

آپا یہ کون لڑکی تھی؟ پہلے تو اسے کہیں نہیں دیکھا۔"

"میری منہ بولی بہن جو گوجرانوالہ میں رہتی ہے، یہ اس کی لڑکی ہے اور تم نے پہلے کیسے نہیں دیکھا۔۔۔۔۔۔" آپا عطی نے تعجب سے کہا۔ "بھئی، کل تمہارے ہاں میرے ساتھ ہی تو تھی۔"

آرٹسٹ سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اس آسمانی اپسرا کو کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔ اپسرا جو مکان کی دوسری منزل سے نہیں بلکہ آسمان کے ساتویں اور آخری خواب زار سے کسی ان سنے آفاقی گیت کی پرسکون لہر بن کر صحن میں اس کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔

اس کے دھلے ہوئے پاکیزہ کنول ایسے ہاتھ میں مخمل کی ڈبیا تھی۔ یہ اس کے مقدس پیار کی نشانی تھی۔ اس کی آواز میں صبح کی تازگی اور محبت کی شیرینی تھی۔ گویا وہ پہلی بار بول رہی ہو۔ اس کے لبوں سے نکلے ہوئے الفاظ پھول بن کر فضا میں تیر رہے تھے۔ وہ ان پھولوں کو اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگاتا، چومتا اور سینے میں اتار کر انہیں دل کی دھڑکنوں میں جذب کر لینا چاہتا تھا۔

وہ دیر تک اس لڑکی کے متعلق غور کرتا رہا اور خود بخود ایک پردہ سا اس کی آنکھوں کے سامنے سے اٹھتا گیا۔ ایک دیواری پرے کھسکتی گئی، دھند، روشنی اور تاریکی کے ملے جلے غبار کی دھیمی چمک میں اس نے دیکھا نانا جان پلنگڑی پر اونگھ رہے ہیں، اس کی پیاری بہن زیب بوریئے پر بیٹھی سکول کا سبق دہرا رہی ہے۔ دیوار پر ایک تصویر میں شیکسپیئر، ہملٹ کے بارے میں سوچ رہا ہے، نیچے ماں،

آرٹسٹ کی بھوکی اور مظلوم ماں سر ایک طرف جھکائے چرخہ کات رہی ہے، فضا میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی اور چوہدری نواب دین ٹیلیفون پر چیخ رہا ہے اور چقندر اور ادرک تلوا رہا ہے۔ الماری میں سجی ہوئی کتابیں بے زبان جانوروں کی مانند اسے رحم طلب نگاہوں سے تک رہی ہیں اور ماں کے پاس ہی پیڑھی پر ایک دبلی پتلی سی لڑکی، وائل کی پھولدار قمیض پہنے دوپٹے شانوں پر ڈھلکائے ویران اور بے معنی نگاہوں سے دیواروں پر لٹکی ہوئی تصاویر دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد سا ہے، کیک کے رنگ ایسا ------ اس کے بال قدرے پریشان ہیں۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ہے۔ آرٹسٹ نے اس کی گردن کے لطیف خم اور پلکوں کے نازک جھکاؤ میں کوئی جمالیاتی تناسب پیدا کرنا چاہا مگر ایک پردہ سا گر گیا۔ دیوار سی کھڑی ہو گئی۔ ایک پردہ، ایک دیوار، ایک خلیج ------ مگر آرٹسٹ نے اس اپسرا کو پہچان لیا تھا۔ اس کی نگاہیں پردے کو چیر گئی تھیں، وہ دیوار میں کود گیا تھا، خلیج پاٹ چکا تھا۔

انسان بڑا ہی ذلیل جانور ہے ------ اسے ایک دن روٹی نہ ملے تو اس کے ذہن کا سارا حسن، تمام آرٹ اور فن بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے، ساری جمالیاتی بنیادیں کھسکنے لگتی ہیں، تمام دیوتا اوندھے منہ گر پڑتے ہیں، پھر کئی پردے کھنچ جاتے ہیں، کئی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں، کئی صحرائے اعظم پھیل جاتے ہیں اور کئی خلیجیں حائل ہو جاتی ہیں۔ یہ بڑی ہی کچی عمارت ہے، یہ بڑا ہی بھوکا ہے، بڑا ہی چھوٹا ہے ------

اور ------

اللہ بہت بڑا ہے ------ اللہ بہت بڑا ہے

مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔

◆◆◆